عرض احوال

بسم اللہ الرحمن الرحیم

موجودہ آزمائش میں نجات کی راہ!

مشرف شیرون ملاقات اتفاقی تھی یا طے شدہ' اصل صورتِ حال سے سب واقف ہیں' کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ آج ہم اپنی آزادی کھو چکے ہیں' ہمارے تمام فیصلے غیر کر رہے ہیں اور امریکہ کی خوشنودی حاصل کرنا قومی سطح پر ہمارا مقصدِ حیات بن چکا ہے۔ ان حالات میں اہم سوال یہ ہے کہ اس مشکل گھڑی اور آزمائش میں ہمارے لیے نجات کی راہ کون سی ہے!

سورۃ الضحیٰ اور سورۃ الانشراح قرآن حکیم کی دو جڑواں سورتیں ہیں۔ ان کا اصل سبق یہ ہے کہ دکھ سکھ' راحت و رنج' آسانی و مشکل اور امتحانات و آزمائش سے سب کو گزرنا پڑتا ہے' افراد کو بھی اور اقوام کو بھی۔ مشکلات اور امتحانات سے گزر کر ہی ترقی کے راستے کھلتے ہیں۔ چنانچہ کوئی قوم یا فرد اگر اللہ اور دین کے ساتھ خلوص و اخلاص کا معاملہ رکھے تو کسی سخت آزمائش کے بعد اللہ کی رحمت سے قوی امید ہوتی ہے کہ خیر برآمد ہوگا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو سخت آزمائشوں سے گزار کر بلند مقامات عطا کیا کرتا ہے۔ لیکن ہمارا معاملہ بالکل برعکس ہے۔ من حیث القوم ہمارا ایمان بظاہر اللہ پر ہے' لیکن یقین اور توکل امریکہ پر ہے۔ ہم امریکہ کی رضا اور یہود و نصاریٰ کو خوش کرنے کی خاطر دین کا حلیہ بگاڑنے اور اللہ کو ناراض کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ چنانچہ آج ہم جس آزمائش سے دوچار ہیں اس میں سارا قصور ہمارا اپنا ہے اور ہم ایک خوفناک انجام کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ لیکن اگر اس آزمائش سے یہ خیر برآمد ہو جائے کہ ہم ہوش میں آ جائیں' اپنا قبلہ درست کر لیں اور اصلاحِ احوال پر کمربستہ ہو جائیں تو اللہ کی رحمت اب بھی ہمارے شامل حال ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر ہم نے اللہ' اس کی کتاب اور اس کے رسولؐ سے بے وفائی کی روش جاری رکھی تو پھر ہمیں اس انجام بد سے کوئی نہ بچا سکے گا جس کی طرف ہم تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ oo

ماہِ مبارک کا پیغام

رمضان کے ماہِ مبارک کو قرآن سے جو نسبت ہے' اس کا بیان تکرار کے سوا کیا ہے' تاہم جن بندگانِ خدا کو کتابِ ہدایت کے ساتھ اس مہینے کی راتیں اس انداز میں گزارنے کی سعادت نصیب ہوتی ہے کہ ضمیر پر نزولِ کتاب ہو رہا ہو تو بقول حکیم الامت وہ گرہ کشائی ہوتی ہے جو رازی کے بس کی بات ہے نہ صاحبِ کشاف کے بس کی' اور ان کے اس ایقان کی پھر سے آبیاری ہوتی ہے کہ حکمت کا اصل خزانہ کتاب اللہ ہی ہے اور لاریب جس نے اس سے تعلق جوڑ لیا' وہ ہر طرح کی گمراہی سے بچ گیا۔

یہ کتابِ زندہ واقعی نبی اکرم ﷺ کا وہ لاثانی معجزہ ہے جس کی تاثیر ابدالاباد تک نہ صرف برقرار رہے گی بلکہ انسانی شعور و آگہی کی سطح کی بلندی کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی جائے گی۔ ذہن انسانی کے افق پر اس کے مطالب و مفاہیم کے نئے سے نئے شمس و قمر طلوع ہوں گے اور فکرِ سلیم میں ہدایت و رہنمائی کے تازہ چشمے ابلتے رہیں گے۔ اس کی فصاحت و بلاغت کا کیا ٹھکانا جس نے زمانۂ قدیم میں شعرِ جاہلی کا ہی منہ بند نہ کیا' دورِ جدید کی مخصوص طلاقتِ لسانی کو بھی مبہوت کر کے رکھ دیا ہے۔

ہمارے ہاں انتشارِ فکر کیوں پایا جاتا ہے؟ لوگ دُور دُور کی کوڑیاں کیوں لاتے ہیں جن سے تفریح کے سوا کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا؟؟ عقل و دانش کے پہاڑ کھود کر ہم چوہے نکالتے ہیں تو اس لیے کہ حکمت کے اصل خزانے سے ہم نے اپنا ذہنی رشتہ منقطع کر لیا ہے۔ آج بھی وہ لوگ جو قوم کی رہنمائی کے منصب پر فائز ہیں یا کم از کم وہی جن کے ذمے انسانیت کو فکری غذا فراہم کرنے کا کام ہے' اگر قرآنِ حکیم کو اپنا امام بنا لیں تو ہم گھپ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے سے بچ جائیں' اور اس صراطِ مستقیم پر گامزن ہو سکتے ہیں جو فلاحِ اُخروی اور رضائے الٰہی کے حصول کی منزل تک جاتا ہے۔

رمضان المبارک کا یہی پیغام ہے' آپ کے لیے بھی اور میرے لیے بھی!oo

(جناب اقتدار احمد مرحوم کی 1991ء کی ایک تحریر)

شہرٌ عظیمٌ ..... شہرٌ مبارکٌ

قرآن مجید اور رمضان المبارک کا ربط و تعلق

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد

یہ خطاب محترم ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ نے ۹ رشوال المکرّم ۱۴۰۵ھ (۲۸ جون ۱۹۸۵ء) کو شمالی ناظم آباد کراچی میں ایک اجتماعِ جمعہ سے فرمایا تھا' جسے محترم شیخ جمیل الرحمٰن (مرحوم ومغفور) نے کیسٹ سے منتقل کر کے قدرے حک واضافہ کے ساتھ مرتب کیا اور اسے افادۂ عام کے لیے حکمت قرآن میں شائع کیا گیا۔ اب یہ مضمون مزید نظر ثانی کے بعد قارئین میثاق کی نذر ہے۔

نحمدہٗ ونصلی علی رسولہ الکریم

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ــــ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْکُمْ مَّوْعِظَۃٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ وَھُدًی وَّرَحْمَۃٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۵۷﴾ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰہِ وَبِرَحْمَتِہٖ فَبِذٰلِکَ فَلْیَفْرَحُوْا ھُوَ خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ ﴿۵۸﴾﴾ (یونس)

عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمَا اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ : ((اَلصِّیَامُ وَالْقُرْآنُ یَشْفَعَانِ لِلْعَبْدِ ' یَقُوْلُ الصِّیَامُ : اَیْ رَبِّ اِنِّیْ مَنَعْتُہُ الطَّعَامَ وَالشَّھَوَاتِ بِالنَّھَارِ فَشَفِّعْنِیْ فِیْہِ ' وَیَقُوْلُ الْقُرْآنُ : مَنَعْتُہُ النَّوْمَ بِاللَّیْلِ فَشَفِّعْنِیْ فِیْہِ ' فَیُشَفَّعَانِ)) (رواہ البیھقی فی شعب الایمان)

ادعیہ ماثورہ کے بعد :

آج کا موضوع ہے ''قرآن مجید اور رمضان المبارک کا ربط و تعلق''۔ اس ضمن میں رمضان المبارک کی فضیلت کی جو بنیاد اور اساس ہے' قرآن مجید کی جس عظیم آیت مبارکہ میں رمضان المبارک کے روزے رکھنے کا حکم وارد ہوا ہے اور اس کا اختتام جس موضوع پر ہوا ہے' اس کے ضمن میں کچھ باتیں اختصار کے ساتھ پیش کی جا رہی ہیں۔

روزہ کی غرض و غایت

روزہ ایک عظیم عبادت ہے۔ اس کی اپنی جگہ ایک حکمت' مقصد اور غرض و غایت ہے۔ اگر سال کے کسی بھی مہینہ کو اِس عبادت کے لیے منتخب کر لیا جاتا تو روزے کا اصل مقصد حاصل کیا جا سکتا تھا' یعنی ضبطِ نفس اور تقویٰ۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الصِّیَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ (البقرۃ)

''اے اہل ایمان! تم پر روزہ فرض کر دیا گیا جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا' تاکہ تم میں تقویٰ کی صفت پیدا ہو''۔

یعنی روزے کا مقصد یہ ہے کہ انسان میں یہ صلاحیت اور استعداد پیدا ہو جائے کہ وہ اپنے حیوانی داعیات اور تقاضوں پر قابو رکھ سکے۔ اس میں جو حیوانی جبلتیں (animal instincts) ہیں یہ اندھی اور بہری ہیں۔ انہیں صحیح و غلط' جائز و ناجائز اور حلال و حرام میں تمیز کی صلاحیت حاصل نہیں ہے۔ مثلاً پیٹ کھانے کو مانگتا ہے تو اس کو اس سے غرض نہیں کہ وہ جائز ہے یا ناجائز' حلال سے حاصل کیا گیا ہے یا حرام سے۔ اسی طرح انسان کی جنسی خواہش جب انگڑائیاں لیتی ہے تو انسان بالعموم اندھا اور بہرہ ہو جاتا ہے اور وہ اپنے اس جذبہ کی تسکین چاہتا ہے۔

اب اگر کوئی شخص اپنے ان حیوانی تقاضوں کا محکوم اور غلام بن جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ انسان کے روپ میں اصل میں وہ حیوان ہے۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ کثیر تعداد میں انسان ایسے ہیں کہ جن کی اصل حیثیت یہ ہے کہ: ﴿اُولٰٓئِكَ

كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ﴾ (الاعراف:۱۷۹) ''وہ چوپایوں کی مانند ہیں' بلکہ اُن سے بھی گئے گزرے''۔ درحقیقت انسان کہلانے کا حق دار وہ ہے کہ جس کی خودی اتنی قوی ہو کہ وہ اپنے وجود پر حاکم ہو' اپنی حیوانی جبلتوں کو اپنے قابو میں رکھ سکے' اپنے نفس کے تقاضے پورے کرے لیکن صرف جائز ذرائع سے۔ اور ظاہر بات ہے کہ ایک مسلمان کے لیے قانونی اور جائز طریقہ صرف وہی ہے جس کی اجازت اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے مرحمت فرمائی ہے۔ بہرحال روزے کی اصل غرض وغایت یہ ہے۔

ماہِ صیام کے انتخاب کی حکمت

یہ انتیس یا تیس روزے اگر کسی بھی مہینہ میں مقرر فرما دیے جاتے تو یہ مقصد تو حاصل ہو جاتا۔ لیکن اس میں اللہ تعالیٰ نے ایک اضافی حکمت یہ شامل فرمائی کہ اس عظیم عبادت کے لیے مہینہ وہ منتخب فرمایا جو نزولِ قرآن کا مہینہ ہے: ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ﴾ ''رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا''—— وہ قرآن کیا ہے! ﴿هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ﴾ (البقرۃ:۱۸۵) ''یہ (قرآن وہ کتاب ہے جو) لوگوں کے لیے صحیح راستہ بتانے والی اور حق و باطل کے درمیان کھلے دلائل کے ساتھ امتیاز کرنے والی ہدایت ہے''۔

اس مہینے میں دن کے روزے کے ساتھ اضافی طور پر رات کا قیام بھی شامل کر دیا گیا۔ احادیث میں یہ دونوں چیزیں بالکل متوازی بیان ہوئی ہیں۔ حضور ﷺ کا ارشادِ مبارک ہے:

((مَنْ صَامَ رَمَضَانَ اِیْمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَ لَـــــهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ ' وَمَنْ قَامَ رَمَضَانَ اِیْمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَ لَـــــهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ))

''جس کسی نے رمضان کے روزے ایمان اور احتساب کے ساتھ رکھے (یعنی روزے کی تمام شرائط و آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے) اس کے لیے مغفرت ہے (بخشش ہے' معافی ہے) ان گناہوں کی جو اُس نے پہلے کیے اور جس کسی نے (روزے کے ساتھ ساتھ) رمضان کی راتوں میں قیام کیا ایمان اور احتساب کے ساتھ اُس کے لیے مغفرت ہے اُن گناہوں کی جو اُس نے پہلے کیے''۔

(۱) متفق علیہ۔

یعنی رمضان میں قیام اللیل کرنے والے کے لیے بھی سابقہ گناہوں کی بخشش کی بشارت دی گئی ہے۔ آغازِ خطاب میں جو حدیث پیش کی گئی ہے اب اس کا ترجمہ ملاحظہ کیجیے۔ اس سے مزید واضح ہو جائے گا کہ رمضان میں دن کا صیام اور رات کا قیام متوازی پروگرام ہیں' ان کا چولی دامن کا تعلق ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''روزہ اور قرآن دونوں (قیامت کے روز) بندے کے حق میں سفارش کریں گے۔ (یعنی اُس بندے کی جو دن میں روزے رکھے گا اور رات میں اللہ کے حضور کھڑے ہو کر اُس کا پاک کلام قرآن مجید پڑھے گا یا سُنے گا) روزہ عرض کرے گا: اے میرے پروردگار! میں نے اس بندے کو دن میں کھانے پینے اور نفس کی خواہشات کو پورا کرنے سے روکے رکھا تھا' پس آج میری سفارش اس کے حق میں قبول فرما (اور اس کے ساتھ مغفرت و رحمت کا معاملہ فرما!)۔ اور قرآن کہے گا: میں نے اس کو رات کو سونے اور آرام کرنے سے روکے رکھا تھا' خداوند! آج اس کے حق میں میری سفارش قبول فرما (اور اس کے ساتھ بخشش اور عنایت کا معاملہ فرما!)۔ چنانچہ (روزہ اور قرآن) دونوں کی سفارش (اُس بندے کے حق میں) قبول کی جائے گی (اور اس کے لیے جنت اور مغفرت کا فیصلہ فرما دیا جائے گا)۔''

میں نے جو احادیث بیان کی ہیں ان سے یہ بات مبرہن ہو کر سامنے آ جاتی ہے کہ اصل میں رمضان کا پروگرام دو آتشہ ہے۔ یعنی دن میں صیام اور رات کو قیام۔ اور یہ قیام صرف ایک یا ڈیڑھ گھنٹے کا کافی نہیں ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے تو درحقیقت صرف تین روز تہجد کے وقت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو باجماعت نماز ادا کرائی' جسے اب ''صلوٰۃ التراویح'' سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد آپؐ نے یہ سلسلہ جاری نہیں رکھا کہ کہیں یہ فرض نہ ہو جائے۔ یہ اُمت کے حق میں آپؐ کی شفقت و رحمت ہے۔ بعد میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں اصحاب الرائے اور اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مشورے اور اس تحقیق کے بعد کہ رمضان المبارک میں رات کی نفل نماز کا حضور ﷺ کا اکثر و بیشتر معمول کیا تھا' اور اس دلیل کی بنیاد پر کہ حضور ﷺ

کے اس دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد نبوت اور وحی کا سلسلہ ابدالآباد تک ختم ہو گیا' لہٰذا اب کوئی عبادت فرض کیے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور حضور ﷺ سے رمضان المبارک میں ان نوافل کی باجماعت ادائیگی ثابت ہے' عشاء کی نماز کے بعد ''صلوٰۃ التراویح'' کا نظام قائم فرمایا جو آج تک جاری وساری ہے اور اِن شاء اللہ تا قیامِ قیامت جاری رہے گا۔ اسے اس اصول کے تحت اپنے پیش نظر رکھنا چاہیے کہ ''مَا لَا یُدْرَکُ کُلُّہٗ لَا یُتْرَکُ کُلُّہٗ کہ کم از کم یہ تو ہو جائے کہ مسلمان صلوٰۃ التراویح باجماعت ادا کر لیں اور سال بھر میں ایک مرتبہ اس طریقے سے باجماعت قرآن مجید ختم کر لیا جائے۔

لیکن یہ بات جان لیجیے کہ یہ کم سے کم ہے۔ حقیقت میں رمضان کی حکمت کا تقاضا تو یہ ہے کہ دن روزہ کی حالت میں بسر ہو اور رات قرآن مجید کے ساتھ قیام کرتے ہوئے گزرے۔ بہرحال ان دونوں چیزوں کا جو حاصل ہے اسے قرآن مجید میں بایں الفاظ مبارکہ بیان کیا گیا: ﴿وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿١٨٥﴾﴾ (البقرۃ) ''اور یہ اس لیے (تمہیں بتایا جا رہا) ہے تاکہ تم روزوں کی تعداد پوری کر سکو اور جس ہدایت سے اللہ نے تمہیں سرفراز کیا ہے اس پر اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا اظہار و اعتراف کرو اور شکر گزار بنو''۔ یعنی ایک تو یہ کہ تم تعداد پوری کرو۔ یعنی سفر یا کسی مرض کی وجہ سے اگر چند روزے چھوٹ جائیں تو بعد کے دنوں میں ان کی قضا ادا کرو۔ اور پھر صیام و قیام کے اصل حاصل کے متعلق یہ فرمایا کہ تم اللہ کی تکبیر کرو' اُس کی کبریائی کو بیان کرو اِس ہدایت پر جو اُس نے تمہیں عطا فرمائی ہے۔ یہاں تکبیر سے مراد ہے گہرے احساس کے ساتھ اور دلی اعتراف کے ساتھ قرآن حکیم اور اللہ کی عظمت و جلالت کو تسلیم کرنا اور اپنے نفس کی جائز خواہشات سے بھی اپنے خالق و مالک کی رضا جوئی کے لیے صیام و قیام کی صورت میں دست بردار ہو جانا۔ یہ گویا حال و قال دونوں شکلوں میں اللہ کی تکبیر ہے۔ آگے فرمایا: ﴿وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿١٨٥﴾﴾ ''اور تاکہ تم شکر کر سکو''۔ تم پر یہ بات واضح ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کا

کتنا بڑا انعام اور احسان ہے ہم پر کہ اس نے اپنی یہ کتابِ ہدایت' قرآن مجید' فرقانِ حمید ہمیں عطا فرمائی ہے۔ جب تک اس انعام واکرام اور احسان ونعمت کی قدر و قیمت کا انکشاف نہیں ہوگا اس کی مناسبت سے ہم شکر ادا نہیں کر سکتے۔

امام راغب اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ''مفردات'' میں ''شکر'' کے موضوع پر بڑی پیاری بحث کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ شکر کے تین مدارج و مراحل ہیں۔ پہلا درجہ ''شکر بالقلب'' ہے۔ بالفرض کسی نے آپ پر کوئی احسان کیا یا آپ کو کوئی نعمت عطا کی' تو پہلے درجے میں آپ کے دل میں قدر ہو کہ کتنا بڑا احسان آپ پر کیا گیا ہے یا یہ کہ کتنی بڑی نعمت آپ کو دی گئی ہے۔ اگر یہی نہیں ہے تو شکر کیا ادا ہوگا! اسے ایک مثال سے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے کہ اگر کسی بچے کے ہاتھ پر کوئی ہیرا رکھ دیا جائے تو اس بے چارے کو کیا پتا کہ یہ ہیرا ہے یا کانچ کا ایک ٹکڑا! جس کو معلوم ہے کہ یہ ہیرا ہے وہ تو اس عنایت یا عطیہ کا شکر ادا کرے گا جیسا کہ اس کا شکر ادا کیا جانا چاہیے۔ لیکن جس کو پتا ہی نہیں کہ یہ ہیرا ہے' وہ اس احسان کی مناسبت سے شکریہ ادا نہیں کر سکے گا۔ پس پہلی چیز یہ ہے کہ نعمت اور احسان کی صحیح معرفت حاصل ہو کہ میرے منعم نے مجھے کتنی بڑی نعمت عطا کی ہے' میرے محسن نے مجھ پر کتنا بڑا احسان فرمایا ہے۔ یہ ہے ''شکر بالقلب'' جو شکر کا پہلا درجہ ہے۔

شکر کا دوسرا درجہ ہے ''شکر باللّسان''۔ یعنی کسی کی عطا کردہ نعمت اور کسی کے کیے گئے احسان کا زبان سے شکریہ ادا کرنا جو ہم عموماً کرتے ہیں۔ قرآن مجید کی عظمت اور قدر' جس کا انکشاف ہم پر ہونا چاہیے اور اس کی معرفت ہمیں حاصل ہونی چاہیے' اس کا ذکر سورۂ یونس کی آیات ۵۷ اور ۵۸ میں بہت خوبصورتی اور جامعیت کے ساتھ آیا ہے۔ ان کی تشریح و توضیح تو آگے آئے گی' لیکن قرآن مجید جیسی عظیم ترین نعمت کے نزول پر زبان سے جو شکر ادا ہونا چاہیے' تو اللہ تعالیٰ کا مزید احسان یہ ہے کہ وہ بھی اس نے قرآن مجید ہی میں ہمیں تلقین فرما دیا۔ سورۃ الکہف کی پہلی آیت میں فرمایا:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ یَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا﴾

''کُل شکر، کُل ثنا اس اللہ کے لیے ہے جس نے اپنے بندے (ﷺ) پر کتاب نازل فرمائی (قرآن نازل فرمایا) اور اس میں کوئی کجی نہیں رکھی''۔

بلکہ اسے کِتٰبٌ مُّبِیْنٌ بنایا' یعنی روشن کتاب' واضح کتاب' کھلی کتاب۔ یہ گویا وہ شکریہ ہے جو اللہ نے ہمیں تلقین فرمایا کہ اس طرح میرے حضور میں ہدیۂ تشکر پیش کرو۔

اب اس نعمت اور احسان کے شکر کا تیسرا درجہ ہے ''شکر بالجوارح''۔ یعنی اُس نعمت کا حق ادا کرنا۔ اگر کسی طالب علم کو اُس کے والد نے کوئی بہت اعلیٰ کتاب لا کر دی' اور وہ بچہ بہت مہذب ہے' اس نے فوراً اپنے والد کا شکریہ بھی ادا کر دیا' لیکن اس کے بعد اس کتاب کو ایسا بند کر کے رکھا کہ پھر کبھی کھول کر نہ دیکھا' تو یہ کفرانِ نعمت ہے۔ اس نے حقیقتاً اپنے والد کا شکریہ ادا نہیں کیا۔ اس لیے کہ والد نے کتاب تو اس لیے دی تھی کہ وہ اس کو پڑھے' اس سے اپنے علم میں اضافہ کرے' اس میں جو اچھی اور عمدہ اخلاقی تعلیمات اور پند و نصائح ہیں ان پر عمل کرنے کی کوشش کرے۔ لیکن اگر وہ یہ سب کچھ نہیں کر رہا تو حقیقت میں اس نے ناشکری اور ناقدری کی ہے' چاہے تہذیب کے ناطے سے اس نے زبان سے شکریہ ادا کر دیا ہو۔

اب رمضان المبارک کا اصل حاصل کیا ہونا چاہیے؟ زیر مطالعہ آیتِ مبارکہ ختم ہو رہی ہے اِن الفاظ پر کہ: ﴿وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾ ''اور تاکہ تم شکر گزار بنو''۔ تم پر عظمتِ قرآن کا انکشاف ہو۔ اس لیے کہ جب اس کی عظمت و جلالت کا تم پر انکشاف ہو گا تب ہی تو تم ہمارا حقیقی شکر ادا کر سکو گے' اتنا شکر کہ جتنا تم کو اس انعامِ عظیم پر کرنا چاہیے۔ میں آپ میں سے ہر شخص سے یہ درخواست کروں گا کہ وہ اس ماہِ مبارک کے اختتام پر اپنے ذہن کو ٹٹولے' اپنے دل کی کیفیت کا جائزہ لے کہ اس پورے مہینے کی ریاضت سے اس کے تقویٰ میں' دین سے شغف میں' اللہ پر توکل میں' اللہ کے دین پر عمل کرنے کے معاملے میں اس کی زندگی میں کتنا اضافہ ہوا! اس کے روز و شب میں' اس کی سوچ میں' اس کے فکر میں' اس کے اعمال و اشغال میں کتنی کچھ تبدیلیاں رونما ہوئیں! آخرت کے محاسبے کا کتنا خوف اس کو دامن گیر ہوا! اس دین محمدی علیٰ صاحبہ

الصلوٰۃ والسلام کی سربلندی اور اس کی اقامت کا کتنا جذبہ اور داعیہ اس کے دل میں بیدار ہوا! وہ دین جس کے نام پر یہ ملک حاصل کیا گیا' آج مغلوب ہے' غریب ہے' اس کا مذاق اڑایا جا رہا ہے' اس کا تمسخر کیا جا رہا ہے' اس کے احکام پاؤں تلے روندے جا رہے ہیں' اس کے شعائر مٹائے اور بدلے جا رہے ہیں' معروفات کو دبایا اور منکرات کو فروغ دیا جا رہا ہے۔ اور یہ سب کچھ کرنے والے غیر نہیں ہیں بلکہ اپنے ہیں' مسلمان کہلائے جانے والے ہیں۔

تقویٰ کا اصل معیار

قرآن مجید روزے کا بنیادی مقصد تقویٰ کو قرار دیتا ہے۔ تقویٰ کا بنیادی مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کی نافرمانی سے شعوری طور پر بچ بچ کر زندگی بسر کرنا اور دین کے اوامر پر عمل پیرا ہونے کی پوری پوری کوشش کرنا۔ لیکن بدقسمتی سے اکثر و بیشتر ہمیں یہ خانہ خالی نظر آتا ہے' الّا ماشاء اللہ' شاید ہی کوئی اس سے مستثنیٰ ہو' کوئی لاکھ میں ایک یا ہزار میں ایک ایسا خوش نصیب ہو کہ پورا ماہِ رمضان المبارک گزرنے کے بعد اس کے تقویٰ کی پونجی میں کچھ اضافہ ہوتا ہو۔ ہماری معاش جوں کی توں ہے! اس میں اگر حرام کا کوئی جزو ہے تو وہ جوں کا توں ہے! ہماری معاشرت جوں کی توں ہے! بے پردگی اور بے حجابی ہے تو جوں کی توں ہے! مجال نہیں کہ کسی بھی پہلو سے ہماری زندگی کے مشاغل اور معاملات میں اس ایک مہینہ کی شدید ریاضت کے باوجود بھی کوئی تبدیلی آتی ہو۔ گویا کہ رمضان کے روزے اور تراویح بھی ایک رسمِ محض (ritual) بن کر رہ گئے ہیں کہ ؎

رہ گئی رسمِ اذاں' روحِ بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا' تلقینِ غزالی نہ رہی

ہم نے اسلام کی عظیم ترین عبادات کو بھی محض رسوم بنا کر رکھ دیا ہے۔ ہماری زندگی میں ان کی حیثیت بے مقصد رسومات سے زیادہ نہیں رہی۔ ان کا اصل ہدف' ان کا حقیقی مقصد' ان کی حکمت اور ان کی اصل غرض و غایت پیش نظر ہی نہیں رہی۔

میں یہاں ایک خاص بات اور عرض کر دوں جس کی طرف ہمارے اچھے خاصے دینی شغف اور دینی مزاج رکھنے والوں کی بھی توجہ شاید ہی منتقل ہوتی ہو' اور اگر ہوتی بھی ہو تو اس اہمیت کے ساتھ نہیں ہوتی جو اس کا حق ہے' وہ بات یہ ہے کہ سورۃ البقرۃ کا تینتیسواں رکوع چھ آیات پر مشتمل ہے جس میں روزے کا ابتدائی حکم بھی ہے اور آخری حکم بھی ہے' تفصیلی احکام بھی ہیں' روزے کی حکمتیں بھی ہیں اور اس بات کی وضاحت بھی موجود ہے کہ روزے کی عبادت کے لیے رمضان کو کیوں منتخب کیا گیا! یہ ساری چیزیں بیان کرنے کے بعد اس رکوع کی چھٹی آیت میں یہ بتا دیا گیا کہ تقویٰ کا اصل معیار کیا ہے! تم شکل وصورت اور وضع قطع سے کسی کے تقویٰ کا اندازہ کرتے ہو' لیکن تمہارا یہ تصور قابل اصلاح ہے۔ یہ درست ہے کہ اگر کوئی شخص وضع قطع میں حضور ﷺ کے قریب سے قریب تر ہونے کی کوشش کرتا ہے تو یہ بہت بڑی نیکی ہے' لیکن اگر تقویٰ کا اصل معیار جاننا چاہتے ہو تو وہ چھٹی آیت ہے۔ فرمایا:

﴿وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَا اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾

''اور تم ایک دوسرے کے مال باطل و ناجائز طریقہ سے نہ کھاؤ اور اس کو بطور رشوت کے حکام رسی کا ذریعہ مت بناؤ کہ اس طرح دوسروں کے مال کا کچھ حصہ حق تلفی کر کے ہڑپ کر سکو درآنحالیکہ تم اس (حق تلفی) کو جانتے ہو''۔

یہ آیت اس پر دلیل قطعی ہے کہ اگر اکلِ حلال نہیں ہے تو تقویٰ نہیں ہے' چاہے کوئی نمازوں کی مقدار کتنی ہی بڑھاتا چلا جائے' حج پر حج اور عمرے پر عمرہ کرتا چلا جائے۔ اس لیے کہ اکل حلال ہی تقویٰ کا اصل پیمانہ ہے۔ آخرت میں بھی اسی سے تولا اور ناپا جائے گا کہ تقویٰ ہے یا نہیں! اکلِ حلال کی اہمیت ایک حدیث سے بھی سمجھ لیجیے جس کے راوی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں اور اسے امام مسلمؒ نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔ حدیث قدرے طویل ہے' اس کا آخری حصہ موضوعِ زیر بحث سے متعلق ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ: ((ثُمَّ ذَكَرَ الرَّجُلَ يُطِيْلُ السَّفَرَ اَشْعَثَ

اَغْبَرَ)) ''پھر نبی اکرم ﷺ نے ایک شخص کا ذکر کیا جو ایک طویل سفر طے کر کے آیا ہے' سفر کے باعث پراگندہ سر اور غبار آلود ہے''۔[1] (ان الفاظ مبارکہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کسی ایسے شخص کا ذکر فرما رہے ہیں جو حج کے لیے بیت اللہ شریف تک آیا اور پھر میدانِ عرفات تک پہنچا ہے)۔ ((یَمُدُّ یَدَیْهِ اِلَی السَّمَاءِ یَا رَبِّ یَا رَبِّ)) ''دعا کے لیے اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف پھیلاتا ہے اور کہتا ہے اے میرے پروردگار! اے میرے پروردگار!'' لیکن کیفیت یہ ہے کہ ((وَ مَطْعَمُهٗ حَرَامٌ وَّ مَشْرَبُهٗ حَرَامٌ وَّ مَلْبَسُهٗ حَرَامٌ وَّ غُذِیَ بِالْحَرَامِ)) ''اور اس کا کھانا حرام کا ہے' اس کا پینا حرام کا ہے' اس کا پہننا حرام کا ہے اور (الغرض) اس کا جسم پرورش پایا ہے حرام سے''۔ ((فَاَنّٰی یُسْتَجَابُ لِذٰلِکَ؟))[2] ''تو ایسے شخص کی دعا قبول ہو تو کیسے ہو!'' اس آیت اور اس حدیث کو پیشِ نظر رکھئے اور اس اعتبار سے معاشرے کا جائزہ لیجیے تو واقعہ یہ ہے کہ بڑی مایوسی ہوتی ہے۔ رمضان آتا ہے اور چلا جاتا ہے اور ہماری جو حالت رہتی ہے اس کے اظہار کے لیے میں یہ شعر پڑھا کرتا ہوں ؎

اس آرزو کے باغ میں آیا نہ کوئی پھول
اب کے بھی دن بہار کے یوں ہی گزر گئے!

نیکیوں کا موسم بہار ہر سال آتا ہے اور چلا جاتا ہے' لیکن ہمیں کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اِلّا ماشاءاللہ۔

عظمت قرآنی کے انکشاف کی ضرورت

دوسری چیز جو ہر مسلمان کو حاصل ہونی چاہیے' وہ ہے قرآن مجید کی عظمت کا انکشاف: ﴿وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾ ''اور (اس لیے تمہیں یہ طریقہ بتایا جا رہا ہے) تاکہ تم (روزوں کی) تعداد پوری کر سکو

(۱) شارحین نے لکھا ہے کہ حالت سفر کی پراگندگی اور مسکینی والے شخص کی دعا جلد قبول ہوتی ہے۔ (مرتب)

(۲) صحیح مسلم' کتاب الزکاۃ' باب قبول الصدقة من الکسب الطیب وتربیتها۔

اور جس ہدایت سے اللہ نے تمہیں سرفراز کیا ہے اس پر اللہ کی کبریائی کا اظہار و اعتراف کرو اور تاکہ شکر گزار بنو‘‘۔ اس اعتبار سے بھی ہر شخص اس ماہِ مبارک کے بعد اپنا جائزہ لے کہ کچھ پلّے پڑا یا نہیں پڑا! قرآن مجید سے محبت اور قلبی تعلق میں کچھ اضافہ ہوا یا نہیں! قرآن مجید کی طرف پہلے سے کچھ زیادہ توجہ ہوئی یا نہیں ہوئی! قرآن مجید کی تلاوت کے لیے طبیعت میں پہلے سے کچھ زیادہ آمادگی پیدا ہوئی یا نہیں ہوئی! قرآن مجید پر غور و تدبر کرنے کے لیے عربی زبان سیکھنے کا دل میں کوئی داعیہ پیدا ہوا یا نہیں ہوا!

عظمت قرآن کا بیان قرآن مجید میں بکثرت ہوا ہے۔ مختلف اسالیب اور مختلف پہلوؤں سے ہوا ہے۔ کسی شے کی عظمت ایک اس پہلو سے ہو سکتی ہے کہ اس کا اصل منبع (source) کیا ہے! کہاں سے وہ چیز ملی ہے! تو غور کرنا چاہیے کہ یہ قرآن کہاں سے آیا ہے! یہ کلامِ ربّانی ہے۔ کلام متکلم کی صفت ہوتا ہے۔ یہ گویا اللہ تبارک وتعالیٰ کی ایک صفت ہے‘ اور اُس کا ہم پر کس قدر عظیم احسان ہے کہ اس طریقے سے اس نے ہمارے سامنے ہماری زبان کے حروف و اصوات میں اپنا کلام پیش فرمایا ہے! اللہ تعالیٰ کی ہر صفت کیفیت و کمیت سے ماوراء ہے‘ بلند ہے۔ اُس کی ہر صفت میں ایک اطلاقی شان ہے۔ لیکن اللہ نے انسانی زبان کے حروف و الفاظ اور اس کی اصوات میں اپنی ایک صفت کو متشکل فرمایا اور وہ ہمیں عطا فرما دی۔ یہ ہے قرآن کی وہ عظمت جو سورۃ الحشر میں بایں الفاظ بیان ہوئی:

﴿لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ﴾ (آیت ۲۱)

’’یہ قرآن اگر ہم اتارتے ایک پہاڑ پر تو لازماً تم دیکھ لیتے کہ وہ دب جاتا‘ پھٹ جاتا اللہ کی خشیت سے‘‘۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کوہِ طور پر اللہ تعالیٰ سے یہ درخواست کی تھی کہ: ﴿رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ ؕ﴾ (الاعراف:۱۴۳) ’’پروردگار! مجھے یارائے نظر دے کہ میں تجھے دیکھوں‘‘۔ پہلے بھی مجھے اسی جگہ تجھ سے ہم کلام ہونے کی سعادت حاصل ہوئی تھی۔

اب پھر تو نے طلب فرمایا ہے تو ذرا دیدار کا شرف بھی عطا ہو جائے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب ملا: ﴿لَنْ تَرٰىنِیْ وَلٰـكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِیْ ۚ﴾ ''تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتے (تم میری دید کا تحمل نہیں کر سکتے)' لیکن ذرا اس پہاڑ کی طرف دیکھو (ہم اپنی ایک تجلی اس پر ڈالیں گے) اگر وہ اپنی جگہ ٹھہرا رہا تو تم بھی مجھے دیکھ لو گے''۔ اگر یہ پہاڑ ہماری تجلی برداشت کر جائے تو تم بھی سمجھنا کہ شاید تم ہمارے دیدار کا تحمل کر سکو۔ لیکن ہوا کیا: ﴿فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا﴾ ''پھر جب اس کے ربّ نے تجلی کی پہاڑ کی طرف تو اُس کو ڈھا کر برابر کر دیا اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑے''۔ یہ ایک بالواسطہ (indirect) مشاہدہ تھا۔ وہ تجلی براہِ راست حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نہیں تھی' بلکہ پہاڑ پر تھی' لیکن اس بالواسطہ مشاہدہ کا حاصل یہ ہوا جس کا نقشہ سورۃ الاعراف کی اس آیت میں بیان ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ الحشر کی آیت میں اس کیفیت کو بطورِ تمثیل بیان فرمایا۔ اس لیے کہ قرآن مجید اللہ کی صفت ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کی تجلی کی جو کیفیت ہے جس کا مشاہدہ حضرت موسیٰؑ کو کرایا گیا' وہی تجلی کی کیفیت قرآن مجید میں مضمر ہے۔ یہ بات دوسری ہے کہ ہمارے قلوب حساس نہ ہوں' ہم اس کا شعور وادراک نہ کر سکیں۔

قرآن مجید کی یہ عظمت اس اعتبار سے ہے کہ اس کا منبع اللہ تبارک وتعالیٰ کی ہستی ہے! تو جس ہستی کا یہ کلام ہے' اس کی جلالت وعظمتِ شان کا عالم کیا ہے! عربی کا ایک مقولہ ہے: كَلَامُ الْمُلُوْكِ مُلُوْكُ الْكَلَامِ بادشاہوں کا کلام' کلاموں کا بادشاہ ہوتا ہے۔ جبکہ یہ تو شہنشاہِ ارض وسماوات کا کلام ہے جو اس پورے سلسلۂ کون ومکان کا خالق ومالک ہے۔

قرآن مجید کی افادیت کے نمایاں پہلو

قرآن مجید کی عظمت کا ایک اور بیان سورۂ یونس کی دو آیات (۵۷'۵۸) میں ہوا ہے جو آغاز میں پیش کی گئیں۔ ان میں قرآن کی عظمت کا بیان اس پہلو سے ہے کہ

قرآن میں انسانوں کے لیے افادیت کے کون کون سے پہلو ہیں! اللہ کا کلام ہونے کے اعتبار سے اس کی عظمت اور اس کی جلالتِ شان کا ایک اندازہ دینے کے لیے تو وہ تمثیل بیان ہوئی جس کا ذکر سورۃ الحشر کی آیت ۲۱ میں ہوا۔ اس لیے کہ مطالب کی ادائیگی کے لیے انسانی زبان اور اس کے جو محدود پیمانے ہیں' وہ اس بات کے متحمل ہی نہیں ہو سکتے کہ قرآن کی عظمت کو بیان کیا جا سکے۔ چنانچہ سورۃ الحشر کی متذکرہ بالا آیت کا اختتام ان الفاظ مبارکہ پر ہوتا ہے: ﴿وَتِلۡکَ الۡاَمۡثَالُ نَضۡرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمۡ یَتَفَکَّرُوۡنَ ﴿۲۱﴾﴾ ''اور یہ تو مثالیں ہیں جو ہم لوگوں کے لیے اس لیے بیان کر دیتے ہیں تا کہ وہ غور و فکر کریں''۔ تمثیل بیان کی جاتی ہے ابلاغ کے لیے' ایک اندازہ دینے کے لیے۔ اور یہ درحقیقت ہماری ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ تمثیل کا محتاج نہیں' وہ تو العلیم ہے' السبحان ہے' القدوس ہے۔ چنانچہ سورۃ النور کی آیت ۳۵ کے آخر میں اسے بھی بایں الفاظ واضح فرما دیا گیا: ﴿وَیَضۡرِبُ اللّٰهُ الۡاَمۡثَالَ لِلنَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ﴿۳۵﴾﴾ ''اور اللہ تعالیٰ مثال بیان فرماتا ہے لوگوں کے لیے' اور اللہ تو ہر شے کا جاننے والا ہے''۔ لیکن انسانوں کے لیے جب یہ کلام نازل کیا گیا ہے تو غور طلب بات یہ ہے کہ ان کے لیے اس کلامِ ربانی میں افادیت کے پہلو کون کون سے ہیں! اس مقام پر قرآن حکیم کی افادیت کے چند اہم پہلو بیان کیے گئے ہیں۔ ارشاد ہوا:

﴿یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدۡ جَآءَتۡکُمۡ مَّوۡعِظَةٌ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوۡرِ ۙ وَهُدًی وَّرَحۡمَةٌ لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۵۷﴾ قُلۡ بِفَضۡلِ اللّٰهِ وَبِرَحۡمَتِهٖ فَبِذٰلِکَ فَلۡیَفۡرَحُوۡا ؕ هُوَ خَیۡرٌ مِّمَّا یَجۡمَعُوۡنَ ﴿۵۸﴾﴾

''اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے ربّ کی طرف سے وہ شے آ گئی ہے جو نصیحت ہے' اور دلوں کے امراض کی شفا ہے اور ہدایت اور رحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو (اس پر) ایمان لے آئیں۔ (اے نبیؐ!) کہہ دیجیے یہ اللہ کا فضل اور اس کی مہربانی ہے کہ یہ چیز اُس نے بھیجی۔ پس اس پر تو لوگوں کو خوشی منانی چاہیے۔ یہ ان سب چیزوں سے بہتر ہے جنہیں لوگ سمیٹ رہے ہیں۔''

یہاں قرآن حکیم کی افادیت کے اعتبار سے چار الفاظ استعمال کیے گئے۔ اور میں بعد

میں عرض کروں گا کہ ان چاروں الفاظ کے مابین ربط کیا ہے جو یہاں بیان ہوئے ہیں! پہلا یہ کہ وہ ''مَوعِظَة'' ہے' نصیحت ہے۔ دوسرا یہ کہ وہ ''شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ'' ہے۔سینوں کے اندر جو روگ ہیں وہ ان کا مداوا ہے' ان کی دوا ہے' ان کا علاج اوران کے لیے شفا ہے۔تیسرا یہ کہ ''هُدًی'' ہے' ہدایت ہے۔اور چوتھا یہ کہ وہ ''رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ'' ہے' یعنی اہل ایمان کے حق میں رحمت ہے۔

(۱) مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ

پہلے تو ان چار الفاظ اوران چار چیزوں کو سمجھئے۔دیکھئے اگر ہم میں سے کسی شخص کی طبیعت میں نیکی اور خیر کی طرف کوئی جذبہ اُبھرے' کوئی داعیہ بیدار ہو' تو اسے سب سے پہلا احساس یہ ہوگا کہ اس کے دل میں کچھ سختی سی ہے۔معلوم ہوتا ہے کہ دل کے اوپر کچھ خول سا آ گیا ہے' کوئی crust ہے۔ یہ چیزیں درحقیقت نیکی اور خیر کی طرف پیش قدمی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔آپ کو معلوم ہے کہ اگر کسی شخص کا معدہ خراب ہے' اس کی انتڑیوں میں جذب کرنے کی صلاحیت نہیں ہے تو اسے اعلیٰ سے اعلیٰ دوائیاں بھی فائدہ نہیں پہنچائیں گی' اس لیے کہ وہ جذب ہی نہیں ہوں گی۔ افاقہ تو تب ہوگا جب وہ خون میں داخل ہوں' خون میں جذب ہوں۔یہی وجہ ہے کہ ایسے مریض کو انجکشن لگائے جاتے ہیں تاکہ کسی اور راستے سے دوا اندر پہنچائی جائے۔ تو پہلی بات یہ سمجھئے کہ دل میں اگر سختی آ چکی ہے تو کوئی شے اس پر اثر انداز نہیں ہوگی' اُس میں جذب نہیں ہوگی۔لہٰذا پہلی ضرورت یہ ہوگی کہ دل پر جو خول' جو crust آ گیا ہے اس میں نرمی پیدا کی جائے' اس میں گداز ہو' اس میں حق کو قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔

اب دل کی اس سختی کا معاملہ بھی میں آپ کے سامنے رکھ دوں۔قرآن مجید میں دو مقامات پر اس کا ذکر آیا ہے۔خاص طور پر مذہبی طبقات کے دلوں میں جو سختی اور قساوت پیدا ہو جاتی ہے اسے بیان کیا گیا ہے۔چنانچہ سورۃ البقرۃ میں یہود اور خاص طور پر ان کے علماء کے دلوں کی سختی کا ذکر بایں طور کیا گیا کہ: ﴿ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْ

بَعۡدِ ذٰلِکَ فَهِیَ کَالۡحِجَارَةِ اَوۡ اَشَدُّ قَسۡوَةً﴾(آیت ۷۴)''پھر تمہارے دل سخت ہو گئے اس کے بعد' پس وہ پتھروں کے مانند ہو گئے' بلکہ سختی میں اُن سے بھی بڑھ گئے''۔ آیت کے اگلے حصے میں اس مضمون کو مزید واضح کیا گیا کہ ﴿وَاِنَّ مِنَ الۡحِجَارَةِ لَمَا یَتَفَجَّرُ مِنۡهُ الۡاَنۡهٰرُ ؕ وَاِنَّ مِنۡهَا لَمَا یَشَّقَّقُ فَیَخۡرُجُ مِنۡهُ الۡمَآءُ ؕ وَاِنَّ مِنۡهَا لَمَا یَهۡبِطُ مِنۡ خَشۡیَةِ اللّٰهِ ؕ﴾ ''اور پتھروں میں سے تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس سے چشمے پھوٹ بہتے ہیں۔ اور اُن میں سے کوئی پھٹتا ہے تو اس سے پانی برآمد ہو جاتا ہے۔ اور پتھروں میں وہ بھی ہوتا ہے جو گر جاتا ہے اللہ کے خوف اور خشیت سے''۔ لیکن انسان کا دل جب سخت ہوتا ہے تو اس کی سختی کا مقابلہ اس کائنات کی کوئی شے نہیں کر سکتی۔ یہی بات سورۃ الحدید میں مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمائی گئی: ﴿وَلَا یَکُوۡنُوۡا کَالَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ مِنۡ قَبۡلُ فَطَالَ عَلَیۡهِمُ الۡاَمَدُ فَقَسَتۡ قُلُوۡبُهُمۡ ؕ وَکَثِیۡرٌ مِّنۡهُمۡ فٰسِقُوۡنَ ﴿۱۶﴾﴾ ''اور وہ (مسلمان) ان لوگوں کے مانند نہ ہو جائیں جنہیں اُن سے پہلے کتاب دی گئی تھی' لیکن جب ایک طویل مدت گزر گئی تو اُن کے دل سخت ہو گئے' اور اسی کے باعث ان کی اکثریت فساق و فجار پر مشتمل ہے''۔ قساوتِ قلبی کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ان کے پاس اللہ کی کتاب نہیں تھی' بلکہ کتاب موجود تھی اور وہ اس کی تلاوت بھی کیا کرتے تھے۔ ان کو مخاطب کر کے متعدد مقامات پر فرمایا گیا: ﴿وَاَنۡتُمۡ تَتۡلُوۡنَ الۡکِتٰبَ﴾ ''اور تم کتاب پڑھا کرتے ہو''۔ یعنی تمہارے پاس کتاب موجود ہے۔ اگرچہ اس کے اندر کچھ تحریف ہو گئی تھی' اس میں تھوڑا بہت تغیر و تبدل بھی ہو گیا تھا۔ بایں ہمہ کتاب کا جتنا صحیح حصہ ان کے پاس تھا' اس سے بھی وہ فائدہ نہیں اٹھا رہے تھے۔ اس کی وجہ دراصل یہ دل کی سختی ہے۔ اب ہر شخص کے لیے سب سے پہلے کرنے کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے گریبان میں جھانکے' اپنے دل کو ٹٹولے کہ کہیں اس میں سختی تو نہیں!

دراصل اس کا تعلق انسان کے احساس سے بھی ہے۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ کسی کے سینے میں پتھر ہو اور اسے اس کا احساس تک نہ ہو۔ اور ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ کسی کے دل میں ذرا سی سختی آئے اور وہ پریشان ہو جائے۔ یہ ہے انسان کے اپنے احساس اور

حس کی بیداری کا معاملہ۔ چنانچہ منافق کے بارے میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ نفاق وہ مرض ہے کہ:

((مَا خَافَـهُ اِلَّا مُؤْمِنٌ وَلَا اَمِنَهُ اِلَّا مُنَافِقٌ)) (۱)

''اپنے بارے میں اس کا اندیشہ اور خوف رکھتا ہے صرف مؤمن! اور اس سے اپنے آپ کو محفوظ و مأمون سمجھتا ہے صرف منافق!''

مؤمن کو ڈر لگا رہتا ہے کہ ایمان کی جو تھوڑی بہت پونجی میرے پاس ہے' کہیں وہ ہاتھ سے چلی نہ جائے۔ جس کے پاس ایمان کی رمق بھی موجود نہیں اسے کہاں کا اندیشہ! بقول غالبؔ : ع

''رہا کھٹکا نہ چوری کا' دعا دیتا ہوں رہزن کو!''

یعنی جب ساری دولت چلی گئی تو اب کوئی مجھ پر کیا ڈاکہ ڈالے گا! لہٰذا پاؤں پھیلا کر سوتا ہوں۔ تو جس کے پاس ایمان نہیں وہ تو نچنت ہو جاتا ہے۔ لیکن جس کے پاس ایمان کی پونجی ہے وہ اس کے ضائع ہونے سے ڈرتا رہتا ہے۔ اسی طرح حضور ﷺ نے فرمایا کہ ایک مؤمن سے اگر کبھی گناہ کا صدور ہو جاتا ہے تو وہ ایسے محسوس کرتا ہے جیسے پہاڑ تلے آ گیا ہے۔ اتنا بوجھ اس کے احساس پر ہوتا ہے کہ میں یہ کیا کر بیٹھا! اور ایک منافق جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اسے بھی تھوڑا سا محسوس تو ہوتا ہے' لیکن حضور ﷺ نے بڑی پیاری مثال دی ہے کہ اسے بس اتنا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کسی کی ناک پر مکھی بیٹھ گئی تھی اور اسے اس نے اڑا دیا۔ اپنی اپنی باطنی کیفیات کے اعتبار سے یہ احساسات کا فرق ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ایک وفد باہر سے آیا تھا۔ اس وفد کے سامنے قرآن پڑھا گیا تو قرآن اُن کے دل پر جا کر تیر کی طرح ایسے لگا کہ بے اختیار ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ یعنی وہ کیفیت ہو گئی جس کا نقشہ قرآن مجید میں سورۃ المائدۃ میں کھینچا گیا ہے:

﴿وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا

(۱) صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب خاف المؤمن من ان یحبط عمله وهو لا یشعر

عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ﴾ (آیت ۸۳)

''اور وہ جب سنتے ہیں اس کو جو نازل ہوا رسول پر تو تم ان کی آنکھوں کو دیکھو کہ ابلتی ہیں آنسوؤں سے' اس وجہ سے کہ انہوں نے حق بات کو پہچان لیا۔''

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جب وفد کی یہ کیفیت دیکھی تو فرمایا: هٰكَذَا كُنَّا حَتّٰى قَسَتِ الْقُلُوْبُ ''ہمارا حال بھی کبھی یہی ہوتا تھا یہاں تک کہ ہمارے دل سخت ہو گئے''۔ معاذ اللہ' ثم معاذ اللہ۔ وہ کیا سختی ہو گی! اس پر ہم میں سے کروڑوں کے دلوں کی نرمیاں قربان ہو جائیں۔ ہمارا قلبی سوز و گداز' بلکہ پوری اُمت کا سوز و گداز حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اس کیفیت پر قربان کر دیا جائے تو بھی آپؓ کی قلبی کیفیت افضل رہے گی۔ لیکن یہ بات جو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمائی' یہ احساس کی شدت کا مظہر ہے۔

بہرحال اس سلسلے میں پہلا کام یہ ہے کہ دلوں پر جو خول یا غلاف (crust) آ گیا ہے' اس کو توڑا جائے۔ اسی لیے قرآن کے لیے اللہ تعالیٰ نے پہلا لفظ استعمال فرمایا ''مَوْعِظَة''۔ نصیحت اس بات کو کہتے ہیں جو دل میں گداز پیدا کرنے کا ذریعہ بن جائے' جو دل میں جا کر تیر کی طرح پیوست ہو جائے اور انسان کی طبیعت میں وہ کیفیات پیدا کر دے کہ اس کے دل میں نرمی آ جائے۔

(۲) شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ

جب یہ صورت حال پیدا ہو گی تو اب قرآن دل کے اندر جذب ہو جائے گا اور سرایت کر جائے گا اور نتیجتاً قلب کے جملہ امراض کے لیے شفا بن جائے گا۔ اسی لیے یہاں قرآن کا افادیت کے پہلو سے یہاں دوسرا وصف بیان فرمایا: ﴿وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ﴾۔ جیسے معدے کی اصلاح ہو جائے تو دوا خون میں جذب ہوتی ہے اور خون پورے وجود میں سرایت کرتا ہے اور جہاں جہاں کوئی infection ہے' کوئی خرابی ہے' اس کا ازالہ کرتا ہے۔ اسی طرح کا معاملہ قلب کا ہے۔ یہ قلب جس طرح دورانِ خون کا مرکز ہے اسی طرح ہماری نفسیاتی کیفیات اور ہماری روح کا مرکز و مسکن بھی

ہے۔اگراس قلب کے اندر قرآن مجید کے انوار جذب ہو جائیں' یہ قلب تجلیاتِ قرآن سے منور ہو جائے تو یہ کیفیت وہ ہوگی جسے حضور ﷺ نے یوں بیان فرمایا:

((اَلَا وَاِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَةً اِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ کُلُّهٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ کُلُّهٗ اَلَا وَهِیَ الْقَلْبُ))(۱)

''لوگو! آگاہ ہو جاؤ' یقیناً تمہارے جسم میں ایک لوتھڑا ایسا ہے کہ اگر وہ درست ہو جائے تو پورا وجود درست ہو جائے گا۔اور اگر اس میں فساد ہو (اس میں خرابی اور روگ ہو) تو پورے وجود میں وہ روگ سرایت کر جائے گا۔آگاہ رہو' وہ لوتھڑا قلب ہے''۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ نفسیاتی اور قلبی روگ کون سے ہیں! یہ طبعی (physical) نوعیت کے عوارضِ قلب کی بات نہیں ہو رہی جن سے ہم بالعموم واقف ہیں۔ بلکہ اس قلب میں وہ روگ اور وہ امراض وعوارض جن کی طرف قرآن مجید اور احادیثِ شریفہ میں اشارہ کیا گیا ہے ان کی نوعیت بالکل مختلف ہے! وہ حبِّ دنیا ہے: ﴿کَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ۝﴾(القیٰمة) اور ﴿بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا ۝﴾(الاعلیٰ)۔ وہ حبِّ مال ہے: ﴿وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَیْرِ لَشَدِیْدٌ ۝﴾ (العٰدیٰت)۔ وہ حبِّ شہرت ہے' وہ حبِّ حشمت و وجاہت ہے' وہ حبِّ اقتدار ہے' وہ حبِّ شہوات ولذات ہے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جنہوں نے اس دنیا کو جہنم کا نمونہ بنا دیا ہے' از روئے الفاظ قرآنی: ﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا کَسَبَتْ اَیْدِی النَّاسِ﴾. بر و بحر میں جو مستقل فساد رونما نظر آتا ہے وہ انسانوں کے انہی کرتوتوں کا نتیجہ ہے۔ Thrombosis (دماغ میں انجمادِ خون) اور Heart Failure جیسے امراض تو موت کے لیے بہانہ ہوتے ہیں' جس کا بھی آخری وقت آتا ہے وہ چلتا بنتا ہے: ﴿وَلَنْ یُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا﴾. ان عوارض سے بچ جائے گا تو اجل معین پر کسی اور سبب سے اس دنیا کو خیر باد کہنا پڑے گا۔لیکن وہ اصل اعمال وافعال جنہوں نے اس دنیا کو جہنم کا نمونہ بنایا ہے' وہ حرص ہے'

(۱) صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب فضل من استبرأ لدینه۔ وصحیح مسلم' کتاب المساقاة' باب اخذ الحلال' وترك الشبهات۔

ہوس ہے‘ دولت کی بے پناہ چاہت اور تمنا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿اَلۡهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ ۙ﴿۱﴾ حَتّٰى زُرۡتُمُ الۡمَقَابِرَ ؕ﴿۲﴾﴾(التّکاثر) ’’غفلت میں رکھا تمہیں بہتات کی حرص نے‘ یہاں تک کہ تم نے جا دیکھیں قبریں‘‘۔ بڑے میاں نے بظاہر ٹانگیں قبر میں لٹکائی ہوئی ہیں لیکن دولت کی حرص ختم نہیں ہوئی‘ حالانکہ اتنی دولت موجود ہے کہ کئی کئی پشتیں آرام سے بیٹھ کر کھا سکتی ہیں‘ اس کے باوجود حرام‘ حلال‘ جائز‘ ناجائز‘ غرضیکہ ہر طریقے سے دولت بڑھانے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔ پھر حسد ہے‘ عُجب ہے‘ تکبر ہے‘ انانیت ہے‘ غیظ وغضب ہے‘ ریا ہے۔ قلب کے یہ وہ امراض ہیں جو نیکیوں کو اس طرح چٹ کر جاتے ہیں جیسے دیمک لکڑی کو۔ یہ ہیں قلب کے اصل امراض جن میں دنیا مبتلا ہے۔ اور اگر کہیں یہ امراض دینی طبقہ میں نفوذ کر جائیں تو پھر اس کا کوئی تریاق ہے ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سے بچائے اور اپنی پناہ میں رکھے!

یہود و نصاریٰ کے علم کو قرآن نے کبھی چیلنج نہیں کیا۔ قرآن نے تو یہ کہا ہے: ﴿اَلَّذِيۡنَ اٰتَيۡنٰهُمُ الۡكِتٰبَ يَعۡرِفُوۡنَهٗ كَمَا يَعۡرِفُوۡنَ اَبۡنَآءَهُمۡ﴾ ’’جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے (مراد ہیں یہود و نصاریٰ) وہ انہیں (ہمارے رسولؐ اور قرآن کو) ایسے پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں‘‘۔ کیا ان کی علمی استعداد ختم ہو گئی تھی؟ کیا وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کے بارے میں تورات اور انجیل میں کیا پیشین گوئیاں ہیں؟ لیکن اس پوری علمی استعداد کی نفی کر دینے والی شے تھی دولت کی محبت‘ مال کی محبت‘ حیاتِ دُنیا کی محبت۔ ارشادِ الٰہی ہے: ﴿وَلَتَجِدَنَّهُمۡ اَحۡرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۛ وَّمِنَ الَّذِيۡنَ اَشۡرَكُوۡا﴾ یعنی ان اہل کتاب کو دولت اور دنیا کی محبت میں تم مشرکوں سے کسی طرح کم نہیں پاؤ گے‘ بلکہ یہ اس معاملے میں ان سے بھی بازی لے گئے ہیں۔ ﴿يَوَدُّ اَحَدُهُمۡ لَوۡ يُعَمَّرُ اَلۡفَ سَنَةٍ﴾ ان میں سے ہر ایک کی خواہش یہ ہے کہ اس کی عمر ہزار برس ہو جائے۔ ﴿وَمَا هُوَ بِمُزَحۡزِحِهٖ مِنَ الۡعَذَابِ اَنۡ يُّعَمَّرَ ؕ﴾ اور ان کی یہ طویل عمری بھی ان کو اللہ کے عذاب سے بچانے والی نہیں ہے۔

حبّ دنیا اور حبّ مال و وجاہت کے ساتھ ساتھ حق کو قبول کرنے میں ایک دوسری

بڑی رکاوٹ ان اہل کتاب بالخصوص یہود کا حسد تھا۔ وہ اس غیظ وغضب میں جل بھن رہے تھے کہ آخری نبوت ورسالت کا تاج بنی اسمٰعیل کے ایک چشم و چراغ کو کیوں پہنا دیا گیا! یہ منصب جلیل محمد (ﷺ) کو کیوں مل گیا۔ یہ ہیں اصل میں قلب کے روگ۔ ظاہر بات ہے کہ کسی شخصیت یا طبقے کی جتنی اہمیت ہوگی اسی اعتبار سے اس کے اثرات معاشرے پر مترتب ہوں گے۔ ایک بے چارا عام آدمی جو کسی پر اثر انداز نہیں ہوسکتا' وہ اپنی دووقت کی روٹی کمانے میں لگا ہوا ہے' اس میں یہ روگ ہوں گے بھی تو اُن کے اثرات اس کی ذات تک محدود رہیں گے۔ لیکن اگر یہ روگ لیڈروں میں ہوں' اگر یہ بیماریاں اُن حضرات میں پرورش پا رہی ہوں جو دینی اعتبار سے سربرآوردہ ہوں تو یہ متعدی بنتی ہیں اور وبائی شکل اختیار کرتی ہیں۔ اس لیے کہ جن سے خیر کی توقع ہو ان میں یہ خرابیاں آجائیں تو صورت یہ ہوگی کہ اگر نمک اپنی نمکینی کھو دے تو پھر نمکینی کہاں سے حاصل کی جائے گی؟

یہ ہے وہ چیز جس کی خبر دی تھی جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے کہ مسلمانو! ((یُوْشِکُ اَنْ یَّاْتِیَ عَلَی النَّاسِ زَمَانٌ لاَ یَبْقٰی مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا اسْمُہٗ)) ''اندیشہ ہے کہ لوگوں کو ایک ایسے دور سے بھی سابقہ پڑے گا کہ اسلام میں باقی نہیں بچے گا سوائے اس کے نام کے''۔ دیکھ لیجیے ہماری زبانوں پر ''اسلام زندہ باد'' کے فلک شگاف نعرے ہیں لیکن ہماری انفرادی زندگی میں اسلام خال خال نظر آتا ہے' اور اجتماعی زندگی تو اس سے یکسر خالی ہے۔ ((وَلَا یَبْقٰی مِنَ الْقُرْآنِ اِلَّا رَسْمُہٗ)) ''اور قرآن میں سے باقی نہیں بچے گا مگر حروف کا رسم الخط''۔ یعنی حروف والفاظ تو تا قیامِ قیامت محفوظ رہیں گے' چونکہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ نے لے رکھی ہے ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ لیکن اس کی کماحقہ تلاوت' اس پر غور وتدبر' اس کے اوامر ونواہی پر عمل اور ان کا اجراء' اس کی طرف نوعِ انسانی کو دعوت اور اس کی تبلیغ' یہ کام باقی نہیں رہیں گے۔ رہے بھی تو برائے نام۔ آگے حضور ﷺ فرماتے ہیں: ((مَسَاجِدُھُمْ عَامِرَۃٌ وَھِیَ خَرَابٌ مِّنَ الْھُدٰی)) ''ان کی مسجدیں آباد بہت ہوں گی' لیکن ہدایت سے خالی'

(بباطن) ویران وخراب''۔اس حدیث میں ایک لفظ استعمال ہوا ہے ''خراب'' جو اردو میں بھی مستعمل ہے۔اسی سے بابِ تفعیل میں لفظ ''تخریب'' بنا ہے جس کے معنی ہیں خرابی اور ویرانی پیدا کرنا' توڑ پھوڑ کرنا' بدامنی پھیلانا۔ چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ ایک خاص گروہ کی جانب سے دوسرے مسلکوں کی مسجدوں پر زبردستی اور بزور قبضہ کرنے کے لیے یہی سب کچھ ہو رہا ہے۔ برطانیہ میں تو باقاعدہ خون ریز فسادات ہوئے ہیں جن کی وجہ سے کئی مسجدوں کو مقفل کر دیا گیا ہے تاکہ دنگا فساد رُک سکے۔اور اب تو مساجد باقاعدہ تخریب کاری کا نشانہ بھی بنتی ہیں۔حدیث کے اس ٹکڑے کا مفہوم یہ بھی ہے کہ مسجدیں ہوں گی بڑی عالیشان' بہت اونچی' تعمیر کا اعلیٰ نمونہ' well furnished' قالین بچھے ہوئے ہوں گے' ایئر کنڈیشنر لگے ہوئے ہوں گے' لوگوں سے آباد بھی ہوں گی' لیکن ہدایت سے خالی ہوں گی۔ گویا معنوی طور پر ویران اور خراب ہوں گی۔آگے حضور ﷺ کا وہ ارشاد آ رہا ہے جو دلوں کے روگوں سے متعلق ہے' خاص طور پر جب وہ علماء وفضلاء کے طبقے کی اکثریت میں پیدا ہو جائیں:

((عُلَمَآءُ هُمْ شَرُّ مَّنْ تَحْتَ اَدِيْمِ السَّمَآءِ مِنْ عِنْدِهِمْ تَخْرُجُ الْفِتْنَةُ وَفِيْهِمْ تَعُوْدُ))[1] ''آسمان کی چھت کے نیچے ان کے علماء بدترین لوگ ہوں گے' انہی (علماء) کی طرف سے فتنہ برآمد ہوگا اور انہی میں لوٹ جائے گا''۔ یہاں مراد ہیں علماءِ سوء۔ کیونکہ ایک اور حدیث میں وارد ہوا ہے کہ اُمت مرحومہ کسی دَور میں بھی علماءِ حق اور علماءِ ربانی سے خالی نہیں رہے گی' چاہے وہ معدودے چند ہی ہوں۔جبکہ اِن علماءِ سوء کا کام ہوگا فتنہ پردازی' تفرقہ بازی' مسلمانوں کو آپس میں ٹکرانا' ان کو آپس میں لڑانا' دین میں نئی نئی چیزیں ایجاد کرنا' نئے نئے شعائر کا پرچار کرنا' اپنی علیحدہ علیحدہ علامتیں اور شناختیں متعین کرنا' تاکہ ان کی سیادتیں اور چودھراہٹیں قائم رہیں۔یہ ہے معاملہ دلوں کے روگوں کا!

قرآن مجید کی افادیت والا دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہ امراض کا مداوا اور ازالہ بنے

---

(۱) رواه البيهقي في شعب الايمان۔ بحواله مشكوٰة المصابيح' كتاب العلم۔

E:\Ma-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq october05\ma15-09 quran aur ramdhan.inp 8/22/2014 4:51 PM PAGE 11 (1,1)

گا۔ لیکن شرط یہ ہے کہ دل نرم ہو چکے ہوں' ورنہ قرآن ایسے گزر جائے گا جیسے چکنے گھڑے پر پانی پڑتے ہی بہہ جاتا ہے' جذب نہیں ہوتا۔ جب تک دل کے اندر گداز نہ ہوگا' قرآن مجید کا فائدہ نہیں ہوگا۔ آپ غور کیجیے کہ مشرکین مکہ کو قرآن سنانے والے کون تھے! محمد رسول اللہ ﷺ۔ لیکن کیا ابوجہل پر اثر ہوا؟ چلیے وہ تو دوسرے خاندان سے تھا۔ ابولہب کون تھا؟ آپ ﷺ کا حقیقی چچا! کوئی خاندانی یا قبائلی مغائرت تھی؟ لیکن کیا اس نے کوئی اثر قبول کیا؟ علماء یہود نے کوئی اثر قبول کیا؟ جب کہ قرآن کی گواہی یہ ہے: ﴿یَعۡرِفُوۡنَہٗ کَمَا یَعۡرِفُوۡنَ اَبۡنَآءَ ھُمۡ﴾ انہوں نے جانتے بوجھتے ہوئے بھی کوئی اثر قبول نہیں کیا' اس لیے کہ دل سخت ہو گئے تھے۔ اس میں گداز اور نرمی مفقود تھی۔ لہٰذا پہلی چیز دلوں میں گداز پیدا کرنا ہے۔ زمین میں ہل چلا ہو تو بارش فائدہ دیتی ہے۔ چٹیل میدان میں بارش برستی ہے اور پانی بہہ جاتا ہے۔ ہاں اگر زمین کو تیار کیا ہوا ہے' ہل چلایا ہوا ہے' تو اب کسی کسان سے پوچھئے کہ بارش کا برس جانا اس کے لیے کتنا خوش آئند ہے۔ لہٰذا قرآن مجید پہلے موعظہ ہے اور موعظہ کے بعد ہے: ﴿شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوۡرِ﴾.

(۳) ھُدًی

نوعِ انسانی کے لیے قرآن میں افادیت کا جو تیسرا پہلو ہے اسے اس آیت مبارکہ میں ''ھُدًی'' کے لفظ سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ یعنی قرآن سراپا ہدایت ہے۔ یہ ہدایت کیا ہے! اس سے دراصل مراد ہے انسان کی ذہنی وفکری رہنمائی۔ اس لیے کہ اگر ایک شخص کی عقلی اور ذہنی صلاحیت بہت اونچی ہے لیکن ذہن وفکر میں کجی ہے' نیت میں کھوٹ ہے تو یہ اعلیٰ عقل مندی' اعلیٰ ذہانت فائدہ مند ہونے کے بجائے مضر ہو جائے گی۔ وہ evil genius یعنی برائی کے حق میں غیر معمولی ذہین بن جائے گا۔ ترتیب یہ ہے کہ پہلے دل کے اندر گداز ہو' پھر قلب کے امراض ورذائل کا مداوا اور ازالہ ہو۔ اب گویا پردے ہٹ گئے' حجابات دور ہو گئے۔ اب قرآنِ حمید انسانی فکر کے لیے رہنمائی ہے' انسانی سوچ کے لیے رہنمائی ہے' انسانی مسائل کے لیے رہنمائی ہے۔ تمدنی

ارتقاء کے ساتھ جو بھی نئی سے نئی پیچیدگیاں پیدا ہو رہی ہیں' جو الجھنیں بڑھ رہی ہیں' جو مشکلات پیش آ رہی ہیں' ان سب کا حل اس قرآن مجید کے اندر موجود ہے۔ شرط یہ ہے کہ نیت درست ہو چکی ہو' دل نرم پڑ چکے ہوں' سینے کے اندر کے رذائل کا ازالہ ہو چکا ہو۔ پھر یہی قرآن ہے جو ایسے تمام مسائل کے معتدل و متوازن حل کی طرف رہنمائی کرے گا۔

حضرت علی ؓ سے مروی ایک طویل حدیث میں قرآن مجید کی عظمت و فضیلت کا بڑی جامعیت کے ساتھ بیان ہے۔ حضرت علی ؓ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((اَلاَ اِنَّهَا سَتَكُوْنُ فِتْنَةٌ)) ''آگاہ رہو! عنقریب ایک بہت بڑا فتنہ رونما ہونے والا ہے''۔ حضرت علی ؓ فرماتے ہیں کہ: قُلْتُ مَا الْمَخْرَجُ مِنْهَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ؟ ''میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! اس فتنے سے نکلنے کا کیا راستہ ہے؟'' دیکھئے صحابہ کرام ؓ کا عمومی مزاج کیا تھا! حضرت علی ؓ نے یہ نہیں پوچھا کہ فتنہ کب آئے گا' کیوں آئے گا' کیسا ہو گا اور کہاں سے آئے گا؟ یہ سارے سوالات علمی ہیں۔ صحابہ کرام ؓ کا رجحان عمل کی طرف تھا' لہٰذا حضرت علی ؓ نے سوال کیا تو صرف ایک کہ حضور ﷺ! یہ فرمائیے کہ اس سے نکلنے کا راستہ کون سا ہو گا؟ اس کے جواب میں حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((كِتَابُ اللّٰهِ)) ''اللہ کی کتاب!'' یہی شے ہے جو فتنے سے بچانے والی ہے۔ پھر آپ ﷺ نے کتاب اللہ کی مدح ان الفاظ میں فرمائی: ((فِيْهِ نَبَأُ مَا كَانَ قَبْلَكُمْ وَخَبَرُ مَا بَعْدَكُمْ وَحُكْمُ مَا بَيْنَكُمْ)) ''اس میں تم سے پہلے جو لوگ گزر چکے ان کے حالات بھی ہیں' تمہارے بعد جو حالات آنے والے ہیں ان کی خبریں بھی اس میں موجود ہیں اور تمہارے مابین تا قیامِ قیامت جتنے جھگڑے اور قضیے اٹھیں گے ان سب کا حل اس میں موجود ہے''۔ ((وَهُوَ الْفَصْلُ لَيْسَ بِالْهَزْلِ' مَنْ تَرَكَهُ مِنْ جَبَّارٍ قَصَمَهُ اللّٰهُ ' وَمَنِ ابْتَغَى الْهُدٰى فِيْ غَيْرِهٖ اَضَلَّهُ اللّٰهُ)) ''یہ (قرآن) قولِ فیصل ہے' یہ فضول بات اور یاوہ گوئی سے پاک ہے۔ جو کوئی غرور اور سرکشی کے باعث اس سے مُنہ موڑے گا تو اللہ اس کو توڑ کر

رکھ دے گا۔اور جو کوئی قرآن کو چھوڑ کر کہیں اور سے ہدایت کا متلاشی ہو گا اللہ اسے گمراہ کر دے گا''۔یعنی اس کے حصے میں اللہ کی طرف سے صرف گمراہی آئے گی اور وہ ہدایت سے محروم رہے گا۔ ((وَهُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَتِيْنُ ' وَهُوَ الذِّكْرُ الْحَكِيْمُ)) ''اور قرآن ہی اللہ کی مضبوط رسی (یعنی اللہ سے تعلق کا مضبوط ذریعہ اور وسیلہ) ہے۔[1] اور قرآن ہی محکم نصیحت نامہ ہے''۔سورۂ یونس میں قرآن کو موعظۃ قرار دیا گیا اور یہاں ذکر' جس کا معنی و مفہوم یاد دہانی اور نصیحت ہے۔[2] ((وَهُوَ الصِّرَاطُ الْمُسْتَقِيْمُ)) ..... الحديث[3] ''اور قرآن ہی صراطِ مستقیم ہے''۔نماز کی ہر رکعت میں جب آپ سورۃ الفاتحہ پڑھتے ہیں تو دعا کرتے ہیں :﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ تو وہ صراط مستقیم ہمیں اللہ نے قرآن مجید کی صورت میں عطا کیا ہوا ہے۔ اس پر غور کرو' اسے سمجھو' اس کی گہرائیوں میں غوطہ زنی کرو' تمہیں اپنے تمام مسائل کا حل اسی قرآن میں ملے گا۔

سورۂ یونس کی زیر گفتگو آیت میں لفظ ''هُدًى'' کے حوالے سے میرے غور و فکر کا حاصل یہ ہے کہ ''هُدًى'' یا ''الهدیٰ'' کے لفظ میں ذہنی و فکری رہنمائی کا عنصر غالب ہے۔ظاہر بات ہے کہ جب علمی رہنمائی ہو گی تب ہی عملی رہنمائی بھی ہو گی۔اس لیے کہ صحیح علم صحیح عمل کو جنم دیتا ہے' صحیح فکر صحیح رویہ کو پیدا کرتا ہے' صحیح نقطۂ نظر انسان کے صحیح طرزِ عمل پر منتج ہوتا ہے۔لہٰذا نظریہ اگر درست ہو' فکر درست ہو' رہنمائی صحیح ملے تو عمل بھی درست و صحیح ہو گا۔

---

(۱) سورۂ آل عمران میں جو حکم آیا ہے: ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا﴾ تو حدیث کے اس حصہ نے اس کی تبیین و توضیح اور تشریح و تفسیر فرما دی کہ حبل اللہ سے مراد صرف قرآن مجید ہے۔(مرتب)

(۲) ہم نے نامعلوم ذکر کے کون کون سے طریقے اختیار کر رکھے ہیں! جبکہ الذکر' مجسم ذکر اور سرتاپا ذکر یہ قرآن ہے۔(مرتب)

(۳) سنن الترمذی' ابواب فضائل القرآن' باب ما جاء فی فضل القرآن۔ وسنن الدارمی' کتاب فضائل القرآن' باب فضل من قرأ القرآن۔

(۴) رَحۡمَةٌ لِّلۡمُؤۡمِنِيۡنَ

اب اس آیت مبارکہ کے آخری حصے پر توجہ مرکوز کیجیے! نہایت جامع الفاظ ہیں: ﴿وَّرَحۡمَةٌ لِّلۡمُؤۡمِنِيۡنَ﴾ ''اور (یہ قرآن) اہل ایمان کے لیے مجسم رحمت ہے'' گویا رحمتِ خداوندی کا سب سے بڑا مظہر خود قرآن ہے۔ جیسے فرمایا گیا: ﴿اَلرَّحۡمٰنُ ۙ عَلَّمَ الۡقُرۡاٰنَ ؕ﴾ (الرحمٰن) یعنی اُس ہستی نے جس کی رحمت ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی طرح پُر جوش ہے' بلکہ اس کی رحمانیت کے مقابلہ میں سمندر کا ہیجان پرکاہ کے برابر بھی وقعت نہیں رکھتا' اِس قرآن کا علم عطا کیا ہے۔ اس نے اپنے محبوب اور رحمۃ للعالمین حضرت محمد ﷺ کو اس قرآن کی تعلیم دی ہے۔ (۱) یہی قرآن میدانِ حشر میں اپنے ماننے والوں' دلی یقین رکھنے والوں' اس کی تلاوت کرنے والوں' اس پر غور و تدبر کرنے والوں' اس پر عمل کرنے والوں اور اس کی دعوت دینے اور اس کی تبلیغ کرنے والوں کے حق میں حجت بنے گا' ان کے لیے شفاعت کرے گا۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ سورۃ البقرۃ اور سورۃ آل عمران میدانِ حشر میں دو بدلیوں کی صورت میں ظاہر ہوں گی اور جن کو دنیا میں اِن سورتوں سے محبت تھی' جو ان کو پڑھتے تھے' ان پر سایہ کریں گی۔

قرآن کا ایک پڑھنا ہمارا ہے' یعنی طوطے کی طرح رٹا ہوا اور خیبر میل کی رفتار سے تراویح میں پڑھا ہوا قرآن۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ خیر سے خالی ہے' بلکہ اس کا بھی ثواب تو ملے گا۔ اس لیے کہ ایک شخص اپنے مشاغل اور آرام کو چھوڑ کر آیا ہے' اس نے وضو کیا ہے' عشاء کی نماز ادا کی ہے' پھر اس نے قریباً ایک گھنٹہ صلوٰۃ التراویح میں لگایا

---

(۱) سورۃ الرحمٰن کی ان ابتدائی دو آیتوں پر شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے حاشیہ تحریر فرمایا ہے:
''جو اس (اللہ) کے عطایا میں سب سے بڑا عطیہ اور اس کی نعمتوں میں سب سے اونچی نعمت و رحمت ہے۔ انسان کی بساط اور اس کے ظرف پر خیال کرو اور علم قرآن کے اس دریائے ناپیدا کنار کو دیکھو' بلاشبہ ایسی ضعیف البنیان ہستی کو آسمانوں اور پہاڑوں سے زیادہ بھاری چیز کا حامل بنا دینا رحمان ہی کا کام ہوسکتا ہے۔ ورنہ کہاں بشر اور کہاں خدا کا کلام! (مرتب)

ہے۔ وہ آخر دنیا کا تو کوئی کام نہیں کر رہا! لہٰذا اس کا اجر یقیناً محفوظ ہے۔ لیکن اس طرح سے قرآن کے سننے اور سنانے کا جو اصل مقصد ہے' وہ حاصل نہیں ہوتا۔ اصل بات قرآن کو سمجھنے کی ہے! حضرت عبداللہ بن عمر ؓ فرماتے ہیں کہ ''میں نے صرف سورۃ البقرۃ پر آٹھ برس تک تدبر کیا ہے''۔ حالانکہ عربی زبان ان کی اپنی تھی' صرف ونحو اُن کو نہیں پڑھنی تھی۔ پھر یہ کہ شانِ نزول کی روایات ان کو تلاش نہیں کرنی تھیں۔ آپؓ اُس ماحول کا جزو تھے جس میں قرآن اُترا ہے۔ آپؓ محمد رسول اللہ ﷺ کی صحبت سے فیض یاب اور اکابر صحابہ کرام ؓ سے مستفید ہونے والے بزرگ تھے لیکن پھر بھی سورۃ البقرۃ پر آٹھ برس صرف کر دیے! یہ بات تو بطورِ مثال پیش کی گئی ہے' لیکن تمام صحابۂ کرام ؓ کا حال یہ تھا کہ قرآن مجید کا جتنا حصہ پڑھتے جاتے تھے اس کے مطابق عمل کرتے جاتے تھے۔

بہرحال افادیت کے اعتبار سے سورۂ یونس کی آیت ۵۷ کے حوالے سے یہ چار الفاظ ذہن نشین کر لینے چاہئیں کہ یہ کتاب نوعِ انسانی کے لیے خاص اللہ کی طرف سے موعظہ' شفاء لما فی الصدور' ہدایت اور اہل ایمان کے لیے بالخصوص اور نوع انسانی کے لیے بالعموم رحمت بن کر نازل ہوئی ہے۔

قرآن۔ متاعِ بے بہا

سورۂ یونس کی آیت ۵۸ ہے:

﴿قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۝۵۸﴾

''(اے نبیؐ!) کہہ دیجیے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور رحمت کا مظہر ہے (کہ تمہیں قرآن جیسی نعمت تمہیں عطا ہوئی) پس چاہیے کہ لوگ اس پر شاداں وفرحاں ہوں۔ یہ اُس سب سے بہت بہتر ہے (افضل واعلیٰ ہے) جو کچھ یہ لوگ جمع کر رہے ہیں''۔

لوگ دولتِ دنیا کو قیمتی متاع سمجھتے ہیں اور اس کو جمع کرنے میں حلال وحرام تک کی تمیز نہیں کرتے۔ یہ چیزیں ان کو جہنم کا ایندھن بنانے والی ہیں' جبکہ قرآن رشد وہدایت کی

صراطِ مستقیم ہے جس پر عمل کرنے پر ہی آخرت کی فوز وفلاح اور کامرانی کا اصل دارو مدار ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے ایک ارشادِ مبارک کا مفہوم ہے کہ قرآن مجید جیسی عظیم دولت کے مقابلہ میں اگر کسی کو یہ خیال آیا کہ دولتِ دُنیوی اس سے بڑی دولت ہے تو وہ کفرانِ نعمت کا مرتکب ہوا۔ ظاہر بات ہے اللہ کی نعمت کے کفران کا نتیجہ آخرت میں اللہ کی سزا اور دنیا میں رسوائی اور خواری کے سوا اور کیا نکل سکتا ہے!

ایک بات میں یہ بھی عرض کر دوں کہ بعض اوقات انسان کو کوئی فیض حاصل ہوتا ہے لیکن اسے اس کا شعور نہیں ہوتا۔ میں نے جس شدت سے عمومی صورت حال بیان کی ہے اس سے مایوس نہ ہو جائیں کہ رمضان المبارک ہر سال بس نیکیوں کا موسم بہار بن کر آتا ہے اور گزر جاتا ہے۔ جو حضرات اس ماہِ مبارک میں اہتمام کے ساتھ روزے رکھتے ہیں' صلوٰۃ التراویح ادا کرتے ہیں غیر شعوری طور پر اُن کو ایک دولت حاصل ہوتی ہے' لیکن اس کا انہیں بالعموم شعور حاصل نہیں ہوتا۔ لہٰذا اس رمضان المبارک کے بعد ہم میں سے ہر شخص اپنے آپ کو ٹٹولے اور اللہ تعالیٰ نے ماشہ بھر' تولہ بھر جو خیر بھی کسی کو عطا فرمایا ہو اور قرآن مجید کی طرف جو بھی توجہ ہوئی ہو اسے اپنا بنیادی اثاثہ (starting capital) بنائے اور اس سرمایہ اور اثاثہ میں اضافے کی فکر کرے۔ قرآن کو سمجھنے کے لیے عربی زبان سیکھنے کی طرف توجہ کرے۔ یہ نہ سوچے کہ میری عمر اب پڑھنے کی کہاں رہ گئی ہے! ہم نے اکثر ادھیڑ عمر کے لوگوں کو دیکھا ہے کہ وہ اپنی ترقی کی خاطر ڈیپارٹمنٹل امتحان کے لیے بڑی محنتیں کرتے ہیں۔ تو عمر کا معاملہ رکاوٹ نہیں بنتا۔ بلکہ رکاوٹ بنتا ہے ضعفِ ارادہ۔ اور میں تو یہ کہا کرتا ہوں کہ حضور ﷺ پر قرآن مجید اُس وقت نازل ہونا شروع ہوا جب آپؐ کی عمر چالیس برس کی تھی۔ تو آپ غور کیجیے کہ ہم کو یہ زیب دے گا کہ ہم میں سے کوئی یہ سوچنے لگے کہ میں over age ہو چکا ہوں! ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم قرآن پڑھنے' سمجھنے اور عربی سیکھنے کے لیے دل میں ایک عزمِ مصمم پیدا کریں۔ اس کا اِن شاء اللہ ایک بہت مفید نتیجہ نکلے گا۔

قرآن۔ کتابِ انقلاب

اکثر لوگ جانتے ہوں گے کہ بھارت میں ہائی کورٹ کی سطح پر ایک رٹ داخل کی گئی تھی کہ قرآن مجید پر پابندی لگائی جائے' کیونکہ یہ کتاب اپنے ماننے والوں کو جہاد و قتال کی تعلیم دیتی اور تشویق و ترغیب دلاتی ہے۔ بہرحال وہاں کے ججوں نے بڑی عقل مندی کا ثبوت دیتے ہوئے اس رٹ کو مسترد کر دیا۔ اگر خدانخواستہ وہاں قرآن مجید پر پابندی کا فیصلہ ہو جاتا تو میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ وہاں ایسی قیامتِ صغریٰ برپا ہو جاتی جس کا اندازہ ہم نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ بھارت کا مسلمان ہم سے کئی گنا زیادہ غیور ہے۔ یہی بات کبھی برطانیہ کے لائیڈ جارج نے کہی تھی۔ اس نے برطانیہ کی پارلیمنٹ میں قرآن لہرایا تھا اور کہا تھا کہ ''جب تک دنیا میں یہ کتاب موجود ہے' امن قائم نہیں ہو سکتا''۔[1] یہ بات جسے دشمن اپنی دشمنی کے اظہار کے لیے' دشمنی ہی کے انداز سے بیان کر رہا ہے وہ اصل میں کیا ہے' اس کو معروضی انداز میں سمجھئے۔ واقعہ یہ ہے کہ قرآن وہ کتاب ہے کہ اگر کسی درجہ میں بھی اس کا آپ پر انکشاف ہو جائے تو آپ کے اندر ایک بجلی بھر جائے۔ آپ پھر باطل کے وجود کو برداشت کرنے والے نہیں ہوں گے۔ جس طرح قرآن مجید نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کو متحرک (motivate) کیا ہے وہ نقشہ قرآن میں بھی موجود ہے اور احادیث اور کتب سیر میں بھی موجود ہے۔ اس کتاب نے اُن میں سرفروشی اور جاں نثاری کا ایسا جوش و خروش پیدا کیا کہ وہ گھر بار' اہل و عیال' مال و منال سب چھوڑ کر اپنے سر ہتھیلیوں پر رکھ کر اس عزم و جزم کے ساتھ میدانِ کارزار میں نکل آئے کہ اب یا تو حق کا بول بالا ہوگا اور یا ہم راہِ حق میں اپنی گردنیں کٹوا دیں گے۔ سورۃ الاحزاب میں ان سرفروشوں اور ان فدائین کا ایک نقشہ بایں الفاظ بیان ہوا ہے:

﴿مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۡ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ﴾ (الاحزاب)

(۱) یہی بات آریہ سماج کے مشہور لیڈر سوامی شردھانند نے بھی اغلباً ۱۹۲۷ء میں کہی تھی۔

''اہل ایمان میں سے وہ لوگ بھی ہیں جنہوں نے اللہ سے کیے ہوئے عہد کو سچا کر دکھایا ہے (اس کی راہ میں گردنیں کٹا کر سرخرو ہو چکے ہیں)' پس ان میں سے کوئی اپنی نذر پوری کر چکا اور کوئی اپنی باری آنے کا منتظر ہے' اور ان اہل ایمان نے اپنے رویے اور طرزِ عمل میں ذرّہ برابر تبدیلی نہیں کی۔''

قرآن واقعتاً وہ کتاب ہے جو اِس پر ایمان رکھنے والوں کے اندر بجلی بھر دیتی ہے۔ موجودہ صورت حال تو اس لیے ہے کہ ہم نے اِسے بند کر کے رکھا ہوا ہے' اسے صرف کتابِ مقدس کا درجہ دیا ہوا ہے' اسے حصولِ ثواب بلکہ اب تو زیادہ تر ایصالِ ثواب کا ذریعہ سمجھ رکھا ہے' اس کے سوا کچھ نہیں۔ ورنہ اگر ہم پر یہ قرآن منکشف ہو جائے تو وہ ایمان اور وہ یقین دلوں میں راسخ ہوگا جس کا لازمی نتیجہ یہ عزم ہوگا کہ ہمیں حق کے ساتھ جینا ہے اور حق کے ساتھ مرنا ہے' ہم نے باطل کو للکارنا ہے' اس سے نبرد آزما ہونا ہے۔ ہم نے اسی کا اپنے ربّ کے ساتھ سودا کر لیا ہے۔ جیسے کہ سورۃ التوبۃ میں الفاظ آئے ہیں:

﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ﴾ (آیت ۱۱۱)

''اللہ تعالیٰ نے خرید لی ہیں مسلمانوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال اس قیمت پر کہ ان کے لیے جنت ہے۔ وہ قتال کرتے ہیں اللہ کی راہ میں اور قتل کرتے بھی ہیں اور قتل ہوتے بھی ہیں''۔

اللہ کی راہ میں قتال کا حکم کسی دوسری الہامی کتاب میں نہیں ملتا۔ یہ ہے وہ اصل بات جس سے دشمن خائف رہتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر کسی درجہ میں بھی قرآن مجید سے ہمارا قلبی یقین والا تعلق قائم ہو گیا تو زندگیوں میں انقلاب آئے گا اور پھر واقعتاً وہ انقلاب ایک عظیم عالمی انقلاب پر منتج ہوگا کہ حق کا بول بالا ہو' اللہ کا دین غالب ہو' اللہ کا کلمہ سربلند ہو۔

میں نے آپ کو قرآن حکیم کی طرف اپنی توجہات کو منعطف و مرتکز کرنے کی دعوت دی ہے' آپ کو یاد دہانی کرائی ہے کہ کائنات میں قرآن حکیم اللہ کی رحمت کا

سب سے بڑا مظہر ہے جو ہمیں رحمۃ للعالمین، خاتم النبیین، سید المرسلین جناب محمد ﷺ کی وساطت سے ملا ہے۔ حجۃ الوداع کے خطبہ میں حضور ﷺ نے آخری بات یہی فرمائی کہ: ((وَقَدْ تَرَكْتُ فِيكُمْ مَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدَهٗ اِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِهٖ كِتَابُ اللّٰهِ))(۱)۔ خطبہ کے آغاز میں آپؐ نے فرمایا تھا کہ لوگو! میں تو اب جا رہا ہوں، شاید دوبارہ اس جگہ ملاقات نہ ہو۔ آخر میں فرمایا کہ میں تمہیں بے یار و مددگار چھوڑ کر نہیں جا رہا، میں تمہارے مابین وہ چیز چھوڑ کر جا رہا ہوں کہ اگر اسے مضبوطی سے تھامے رکھو گے تو کبھی گمراہ نہیں ہو گے، اور وہ ہے کتاب اللہ۔ لیکن افسوس صد افسوس کہ ہم نے اسے مضبوطی سے نہیں تھاما اس لیے گمراہ ہوئے، ذلیل ہوئے، خوار ہوئے۔ بقول اقبال ؎

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی
شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی
اے چوں شبنم بر زمیں افتندۂ
در بغل داری کتابِ زندۂ

وہ کتابِ زندہ ہمارے پاس موجود ہے، اس کی طرف رجوع کیجیے! اس کی طرف توجہ دیجیے! اس کو پڑھیے! اس کو سمجھئے! اس پر عمل کیجیے ـــــ اور ہر مسلمان اس کا پرچارک بن جائے، مبلغ بن جائے۔ جیسے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ((بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ آيَةً))(۲) ''پہنچاؤ میری جانب سے خواہ ایک ہی آیت پہنچاؤ!''

بارك الله لي ولكم في القرآن العظيم ونفعني وإياكم بالآيات والذكر الحكيم

---

(۱) صحيح مسلم، كتاب الحج، باب حجة النبي ﷺ۔

(۲) صحيح البخاري، كتاب احاديث الانبياء، باب ما ذكر عن بني اسراء يل۔

منبر و محراب

خطبۂ جمعہ کے عربی متن کا مفہوم (۳)

از: حافظ عاکف سعید

جمعۃ المبارک کے دوسرے خطبے کا آغاز اِن الفاظ سے ہوتا ہے:

☆اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی: ''کل تعریف وثنا اور شکر وسپاس اللہ کے لیے ہے' اور وہ (اپنے بندوں کی حاجات کے لیے) کافی ہے''۔ ہمارا وجود اللہ تعالیٰ ہی کی عطا ہے۔ ہماری مادی اور روحانی ضروریات کا پورا کرنے والا بھی وہی ہے۔ لہٰذا اگر ہم ہر لحظہ اس کا شکر ادا کریں تو بھی حق ادا نہیں ہوسکتا۔ اپنے بندوں کی دعاؤں کو سننے' ان کی مشکل کشائی کرنے اور ان کی حاجت روائی کے اعتبار سے اُسی کی ذات کافی ہے۔ یہ مضمون سورۃ الزمر کی آیت ۳۶ کے آغاز میں بھی بڑے پیارے انداز میں آیا ہے۔ آنحضورﷺ کو تسلی دی گئی کہ: ﴿اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ﴾ ''کیا اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے لیے کافی نہیں ہے!'' یعنی اگرچہ حالات انتہائی ناموافق ہیں اور سردارانِ قریش آپؐ کی جان کے دشمن ہو چکے ہیں لیکن اللہ کے سامنے ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اگر اللہ آپؐ کی پشت پر ہے تو کس بات کا ڈر ہے! اگر دنیا کے تمام طاقتور طبقات اور وقت کے فرعون کسی انسان کے مخالف ہو جائیں تو بھی اللہ تعالیٰ کی ذاتِ واحد اُن سب سے مقابلے کے لیے کافی ہے' لیکن اس کی ایک شرط ہے جو قرآن خود بیان کرتا ہے کہ انسان بھی اللہ کا وفادار بنے اور صرف اُسی پر ایمان رکھے' اس کی مرضی کے مطابق زندگی گزارے اور اسی پر توکل کرے۔ یہ دوطرفہ رشتہ ہے' ورنہ اللہ تعالیٰ بھی انسان کو حالات کے حوالے کر دیتا ہے۔ پھر ایسا انسان اللہ کی حفاظت سے محروم ہو جاتا ہے۔

☆ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی: ''اور دعا وسلام ان بندوں پر

جنہیں اس (اللہ) نے خود چن لیا''۔اس سے مراد تمام انبیاء کرام علیہم السلام ہیں۔انہیں اللہ نے ایک بڑے عظیم مقصد کے لیے چنا۔وہ سب اللہ کے بندے ہیں اور اسی نے انہیں یہ مقام دیا ہے۔لہٰذا ان کے لیے سلامتی کی دعا ہے۔

☆ اَمَّا بَعْدُ: ''اس کے بعد''۔خطاب کے اندر جب ایک مضمون کے بعد دوسرا مضمون شروع ہوتا ہے تو یہ کلمہ ادا کیا جاتا ہے۔

☆ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ قرآن مجید کی آیات کی تلاوت سے پہلے تعوّذ پڑھنا واجب کے درجے میں ہے' اس لیے کہ اس کا حکم خود قرآن مجید میں ہے۔سورۃ النحل کی آیت ۹۸ میں فرمایا گیا: ﴿فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴿۹۸﴾﴾ ''جب تم قرآن کی تلاوت کرنے لگو' تو شیطان مردود سے اللہ کی پناہ میں آ جایا کرو''۔شیطان کی وسوسہ اندازی سے حفاظت کا ایک ہی راستہ ہے' اور وہ یہ کہ جس ہستی کے تابع وہ ہے اس کی مدد حاصل کی جائے۔پھر شیطان حملہ آور نہیں ہو سکتا۔بصورت دیگر اسے پورا اختیار ہے اور وہ انسان کو گمراہ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔چنانچہ قرآنی حکم کے تحت تعوّذ کا اہتمام کیا جاتا ہے۔پھر چونکہ ہر اچھے کام کی ابتدا بسم اللہ سے ہونی چاہیے' اس لیے آیاتِ قرآنی کی تلاوت کے آغاز میں بھی بسم اللہ پڑھی جاتی ہے۔

اس کے بعد یہاں خطبۂ جمعہ میں بالعموم سورۃ الاحزاب کی آیت ۵۶ تلاوت کی جاتی ہے:

☆ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ۚ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿۵۶﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے نبیؐ پر رحمتیں بھیجتے ہیں' اے ایمان والو! تم بھی ان پر رحمت بھیجا کرو اور سلام بھیجا کرو جیسے کہ سلام بھیجا جاتا ہے''۔اس آیت میں ذکر ہے نبی کریم ﷺ پر درود و سلام بھیجنے کا۔اللہ کے منتخب کردہ افراد میں آنحضور ﷺ کا ایک خصوصی مقام ہے کہ وہ خاتم النبیین' آخر المرسلین ہیں اور تمام انبیاء و رُسل کے سردار ہیں۔اس میں کوئی شبہ نہیں۔

نسبت کی تبدیلی سے جس طرح لفظ توبہ کے معنی بدل جاتے ہیں' اسی طرح یُصَلُّوْنَ کا ترجمہ بھی نسبت کی تبدیلی کے حوالے سے مختلف کیا جائے گا۔ سورۃ التحریم کی آٹھویں آیت کے شروع میں مسلمانوں سے کہا گیا کہ: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَی اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا﴾ ''اے ایمان والو! توبہ کرو اللہ کی جناب میں سچی توبہ''۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کے ناموں میں بھی ایک نام ''التواب'' ہے۔ توبہ کی نسبت جب اللہ تعالیٰ کی طرف ہوگی تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ اگر کوئی نافرمان اور باغی بندہ اس کی جناب میں رجوع کرے تو اللہ تعالیٰ رحمت اور شفقت کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ چنانچہ لفظ ''توبہ'' اللہ کے لیے بھی استعمال ہو رہا ہے اور بندے کے لیے بھی' لیکن نسبت بدلنے سے اس کا مفہوم بدل گیا۔ اسی طرح لفظ صلوٰۃ جب اللہ تعالیٰ کی نسبت سے آئے گا تو علماء نے اس کا مفہوم یہ معین کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنحضورﷺ پر مسلسل رحمتوں کا نزول ہوتا ہے۔ فرشتوں کی صلوٰۃ کے بارے میں سورۃ المؤمن کی ساتویں آیت میں ذکر ہے کہ: ﴿وَیَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ ''اور وہ سچے اہل ایمان کے لیے استغفار کرتے ہیں''۔ چنانچہ فرشتے نبی کریمﷺ کے لیے ہر وقت استغفار اور دعائے رحمت کرتے رہتے ہیں۔ اہل ایمان کی صلوٰۃ سے مراد یہ ہے کہ حضور اکرمﷺ پر رحمتوں کے نزول اور ان کے درجات کی بلندی کے لیے پروردگار کی بارگاہ میں دعا کی جائے۔ لہٰذا نبیﷺ پر صلوٰۃ یا درود بھیجنے کا بڑا اونچا مقام ہے۔ یہ نہ صرف بہت بڑی نیکی اور ثواب کا کام ہے بلکہ آنحضورﷺ سے ہماری محبت کا تقاضا بھی ہے۔

صحیح احادیث میں یہ مذکور ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے آنحضورﷺ سے سوال کیا کہ آپؐ پر سلام بھیجنے کے الفاظ تو ہمیں بتا دیے گئے جو نماز کے تشہد میں شامل ہیں' اے اللہ کے رسولؐ! یہ فرمایئے کہ ہم آپؐ پر درود کیسے بھیجیں۔ اگرچہ صرف ''صلی اللہ علیہ وسلم'' کہہ دینا بھی درود ہے' لیکن صحابہ کرامؓ کے سوال کے جواب میں جو درود آنحضورﷺ نے تلقین فرمایا' وہ درودِ ابراہیمی ہے۔ یہ سب سے زیادہ فضیلت والا درود ہے جو ہم نماز میں پڑھتے ہیں اور جس کی تلقین خود آنحضورﷺ نے اُمت کو فرمائی۔ چنانچہ اس

آیت کی تلاوت کے فوراً بعد امتثالِ امر کے طور پر خطیب درود پڑھتا ہے۔

☆اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ: ''اے اللہ! رحمتوں کی بارش نازل فرما حضرت محمد ﷺ پر اور آلِ محمدؐ پر''۔

☆کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَ عَلٰی آلِ اِبْرَاھِیْمَ: ''جیسے کہ تو نے رحمتوں کی بارش برسائی تھی حضرت ابراہیم علیہ السلام پر اور آلِ ابراہیمؑ پر۔''

☆اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ: ''بے شک تو تمام خوبیوں کا مالک اور انتہائی سربلندی والا ہے''۔

☆اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ: ''اے پروردگار! برکتیں نازل فرما حضرت محمد ﷺ پر اور آلِ محمدؐ پر''۔

☆کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی آلِ اِبْرَاھِیْمَ: ''جیسے کہ تو نے برکت نازل فرمائی تھی حضرت ابراہیم علیہ السلام پر اور اُن کی آل پر''۔

☆اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ: ''بے شک تو تمام خوبیوں کا مالک اور انتہائی سربلندی والا ہے''۔

لفظ آل کی وضاحت کے ضمن میں صاحب کشاف نے جو تشریح کی ہے' اس کے مطابق آل اور اہل ایک ہی معنی میں ہیں۔ اہل کے اندر رشتہ دار بھی شامل ہیں اور سارے متعلقین بھی۔ لہٰذا جو آنحضور ﷺ سے جتنا قریب ہے' وہ اتنا ہی اس میں زیادہ شریک ہے۔ لیکن امام رازیؒ نے اس کی جو وضاحت کی ہے' اس کے مطابق لفظ اہل کے اندر زیادہ وسعت ہے' جیسے کسی شہر کے رہنے والوں کو اہل کہا جاتا ہے' جبکہ آل کا تعلق قربت' رشتہ داری اور مصاحبت سے ہے۔ تو آنحضور ﷺ کا جو سب سے زیادہ قریبی حلقہ ہے' چاہے وہ رشتہ داروں کا ہو یا آپؐ کے صحابہ کا' وہ سب آل کے اندر شامل ہیں۔

اس کے بعد خطبے میں چوتھی کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ذکر ہوتا ہے۔ آنحضور ﷺ نے بعض صحابہ کا نام لے کر ان کی مدح فرمائی تھی۔ ان میں سے چار کا حوالہ تمام خطباتِ جمعہ میں ضرور دیا جاتا ہے۔ اہل سنت و الجماعت کے نزدیک خلفائے راشدین کی افضلیت ان کی ترتیب خلافت کے مطابق ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے حضرت ابوبکر

صدیق ؓ کا ذکر ہوا۔

☆ اَرْحَمُ اُمَّتِیْ بِاُمَّتِیْ اَبُوْبَکْرٍ: فرمایا: ''میری اُمت میں سے میری اُمت کے حق میں سب سے زیادہ مہربان ابوبکرؓ ہیں''۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کو رحمۃ للعالمین بنایا تو اسی رحمت کا عکس حضرت ابوبکر ؓ کی شخصیت میں تھا۔ ان کی سیرت کے بے شمار واقعات سے اس کی توثیق ہوتی ہے۔ ان میں سب سے زیادہ نمایاں واقعہ بدر کے قیدیوں کے حوالے سے ہے۔ اُس وقت آنحضور ﷺ اور حضرت ابوبکر ؓ کی رائے ایک ہی تھی کہ ان کے ساتھ نرم معاملہ کیا جائے اور فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے' یا یہ کہ کوئی قیدی کسی مسلمان کو پڑھا دے تو اسی کو فدیے کے طور پر قبول کر لیا جائے۔

☆ وَ اَشَدُّھُمْ فِیْ اَمْرِ اللّٰہِ عُمَرُ: ''اور اللہ (کے دین) کے معاملے میں سب سے زیادہ سخت عمرؓ ہیں''۔ جب احکاماتِ دین یا غیرتِ دین کا معاملہ ہو تو سب سے زیادہ سخت اور بے لچک موقف رکھنے والے صحابیٔ رسولؐ حضرت عمر ؓ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت ابوبکر ؓ نے اپنے خلیفہ اور جانشین کے طور پر حضرت عمر ؓ کو نامزد کیا تو ان کی طبیعت میں سختی کے حوالے سے بعض صحابہ نے اپنے تحفظات کا اظہار کیا تھا۔ اس پر حضرت ابوبکرؓ نے انہیں تسلی دی تھی کہ جب حضرت عمرؓ پر خلافت کا بوجھ پڑے گا تو یہ سختی اعتدال پر آ جائے گی۔ دین کے معاملے میں حضرت عمر ؓ کی سخت مزاجی کے بہت سے واقعات ہیں' جن میں سے ایک کا ذکر قرآن مجید میں سورۃ النساء میں ہوا ہے۔ کسی منافق کا ایک یہودی سے کوئی جھگڑا ہو گیا تھا۔ یہودی چونکہ حق پر تھا' اور یہ جانتا تھا کہ اللہ کے رسول انصاف سے فیصلہ کریں گے' اس لیے وہ منافق کو کھینچ کر حضور ﷺ کی عدالت میں لے گیا۔ آنحضور ﷺ نے یہودی کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ اس پر منافق نے کہا کہ اسے یہ فیصلہ منظور نہیں' حضرت عمرؓ کے پاس چلتے ہیں۔ چنانچہ وہ دونوں حضرت عمرؓ کے پاس آ گئے۔ جب حضرت عمرؓ کو یہ معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ فیصلہ دے چکے ہیں جسے منافق نے قبول نہیں کیا' تو انہوں نے تلوار نکالی اور یہ کہتے ہوئے اس منافق کا سر قلم کر دیا کہ جسے اللہ کے رسول ﷺ کا فیصلہ منظور نہیں اس

کے لیے پھر یہی فیصلہ ہے۔

☆ وَاَکْثَرُھُمْ حَیَآءً عُثْمَانُ: ''اوران میں سب سے زیادہ باحیا عثمانؓ ہیں''۔شرم وحیا انسان کی شخصیت کا ایک خوبصورت رنگ ہے اور نہایت قابل قدر وصف ہے جس میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو انتہائی ممتاز مقام حاصل تھا۔

☆ وَاَقْضَا ھُمْ عَلِیٌّ: ''اوران میں سب سے بڑھ کر درست فیصلہ کرنے والے علیؓ ہیں''۔یعنی معاملات کی سمجھ بوجھ کے حوالے سے سب سے زیادہ صاحب صلاحیت شخص حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔

یہ وہ سرٹیفکیٹس ہیں جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قریبی صحابہ کو عطا کیے۔

اس کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مدح میں کبھی کبھی ایک حدیث اور بھی یہاں پڑھی جاتی ہے' جو مولانا اشرف علی تھانویؒ کے مرتب کردہ خطبات میں شامل ہے۔صحابہ کرام کی فضیلت اور مرتبے کے حوالے سے یہ بہت اہم حدیث ہے۔فرمایا:

☆ اَللّٰہَ اَللّٰہَ فِیْ اَصْحَابِیْ لاَ تَتَّخِذُوْھُمْ غَرَضًا مِنْ بَعْدِیْ: ''میرے اصحاب کے معاملے میں اللہ کا خوف کرو' میرے بعد تم انہیں تنقیص کا نشانہ مت بنانا''۔ یہ درست ہے کہ صحابہ بھی معصوم نہیں ہیں' کسی اجتہادی معاملے میں ان سے غلطی ہوسکتی ہے' لیکن ان پر بدنیتی کا شبہ کرنا ان کی توہین وتنقیص ہے۔ ویسے بھی اجتہادی معاملے میں غلطی گناہ نہیں ہے۔مثال کے طور پر' خلافت سنبھالتے ہی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سامنے یہ مسئلہ پیش ہوا کہ جیش اُسامہ کو' جسے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات کے آخری ایام میں تیار کیا تھا' بھیجا جائے یا روکا جائے۔بعض صحابہ کی رائے یہ تھی کہ اسے نہیں جانا چاہیے' کیونکہ ابھی بہت سے فتنے سر اٹھا رہے ہیں اور معاملات کو سنبھالنے میں دیر لگے گی۔لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فیصلہ کر دیا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تیار کردہ یہ لشکر ہر صورت میں جائے گا۔اس قسم کے فیصلوں کے بارے میں دو آراء ہوسکتی ہیں کہ یہ فیصلہ صحیح تھا یا غلط' لیکن بہرصورت اس پر علماء کا اتفاق ہے کہ جب ایک شخص خلوص سے کوئی اجتہادی فیصلہ کرتا ہے تو اس پر بھی اجر ہے' چاہے نتیجہ کے اعتبار سے وہ غلط ہو جائے۔علمی طور پر تو

یہ کہا جا سکتا ہے کہ فلاں وقت فلاں صحابی سے اجتہادی طور پر غلطی ہوئی‘ لیکن تنقیص یہ ہے کہ ان کی نیت پر حملہ کیا جائے۔ اس کی اجازت نہیں ہے۔ جب قرآن نے یہ گواہی دے دی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں ایمان کو اتنا راسخ کر دیا ہے کہ کفر‘ گناہ اور فسق سے ان کو طبعاً کراہت ہو چکی ہے‘ اس طرف ان کا اب رجحان ہی نہیں ہے تو اُن پر بدنیتی کا حملہ کرنا ایمان کے منافی ہے۔ صحابہ کرام ؓ حضور ﷺ کے تربیت یافتہ افراد ہیں۔ اُن پر الزام تراشی دراصل توہین رسالت سے کم نہیں۔ اس ضمن میں انتہا یہ ہے کہ کوئی ظالم ان کو غاصب اور منافق کہے!

اسی حدیث کے اگلے الفاظ یہ ہیں:

☆فَمَنْ اَحَبَّهُمْ فَبِحُبِّیْ اَحَبَّهُمْ: ’’جو اُن سے محبت رکھتا ہے‘ وہ میری محبت کی وجہ سے اُن سے محبت رکھتا ہے‘‘۔

☆وَمَنْ اَبْغَضَهُمْ فَبِبُغْضِیْ اَبْغَضَهُمْ ’’اور جو اُن سے بغض رکھتا ہے‘ وہ میرے ساتھ بغض کی وجہ سے ان سے بغض رکھتا ہے‘‘۔ یعنی اس کا اصل بغض مجھ سے ہے۔ اس حدیث مبارکہ کی رو سے یہ واضح ہو گیا کہ جو لوگ صحابہ کرام ؓ کی قدر کرتے ہیں‘ وہ دراصل حضور ﷺ سے محبت کرنے والے ہیں اور جو اُن سے بغض رکھیں‘ ان کی نیتوں پر حملہ کریں‘ انہیں اپنے لاشعور میں جھانکنا چاہیے۔ اصل بغض انہیں حضور ﷺ سے ہے‘ جس کا غصہ وہ صحابہ کرامؓ پر نکال رہے ہیں۔

اس کے بعد خطبے میں جو حدیث آپ بالعموم سنتے ہیں‘ اس کے راوی حضرت انس ؓ ہیں اور وہ فرماتے ہیں کہ شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو کہ آنحضور ﷺ نے اپنے خطبہ میں یہ الفاظ ادا نہ کیے ہوں۔

☆لَا اِیْمَانَ لِمَنْ لَا اَمَانَةَ لَهٗ وَلَا دِیْنَ لِمَنْ لَا عَهْدَ لَهٗ: یہ بہت جامع حدیث ہے۔ ’’جس شخص کے اندر دیانتداری کا وصف نہیں اس کا کوئی ایمان نہیں۔ اور جس کے اندر عہد کی پاسداری نہیں اس کا کوئی دین نہیں‘‘۔ یہ ایمان اور دین کو ناپنے کا ایک نہایت مؤثر پیمانہ ہے جو حضور ﷺ نے مقرر فرمایا۔ اسے ہر شخص اپنے اوپر لاگو کرے‘ دوسروں

پر نہیں۔ امانت داری کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی شخص آپ کو امین سمجھ کر ایک چیز آپ کے پاس رکھوا رہا ہے' اب اگر آپ اس میں خیانت کرتے ہیں تو گویا آپ یہ سمجھ کر ایسا کر رہے ہیں کہ ایسی کوئی ہستی نہیں ہے جو آپ کے اس عمل کو دیکھ رہی ہو اور آپ کی پکڑ کر سکے۔ اگر اللہ پر اور آخرت پر ایمان ہے تو یہ بے ایمانی نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا امانت میں خیانت فی الاصل ایمان ہی کی نفی ہے۔ امانت صرف یہی نہیں کہ کسی نے پیسے یا کوئی قیمتی اثاثہ آپ کے پاس رکھوا دیا' بلکہ ذمہ داری کے مناصب بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔ کسی بھی منصب کا حلف اٹھانے کا مطلب یہ ہے کہ پوری ذمہ داری' ایمان داری اور غیر جانبداری کے ساتھ اپنے فرائض ادا کیے جائیں۔ اس میں اقربا پروری' سفارش' رشوت' کوتاہی کا عمل دخل بالکل نہ ہو۔ اگر یہ سب کچھ ہو رہا ہے تو پھر امانت میں خیانت ہو رہی ہے۔ آنحضورﷺ نے تو یہاں تک فرمایا کہ جس شخص سے آپ مشورہ طلب کرتے ہیں' وہ بھی صاحب امانت ہے۔ اس پر اعتماد کر کے آپ نے اسے امین بنایا ہے۔ اب اس امانت داری کا تقاضا یہ ہے کہ وہ واقعتاً پوری سنجیدگی سے غور و فکر کر کے جو چیز آپ کے لیے بہتر سمجھے' وہی مشورے کے طور پر پیش کرے۔

عہد کی پاسداری کے حوالے سے یہ سمجھنا چاہیے کہ ہمارا دین تو نام ہی عہد کا ہے۔ اللہ اور بندے کے درمیان یہی عہد ہے جس کو ایک اور انداز میں سورۃ التوبہ کی آیت ۱۱۱ کے آغاز میں خوبصورتی سے بیان کیا گیا کہ: ﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ﴾ ''اللہ نے خرید لی ہیں مسلمانوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال اس قیمت پر کہ ان کے لیے جنت ہے''۔ اللہ پر ایمان کا مطلب یہ ہے کہ اب یہ جان اور مال اللہ کی مرضی کے مطابق اور اس کے دین کی خدمت کے لیے لگیں۔ جو شخص انسانوں کے ساتھ کیے ہوئے وعدوں کو پورا نہیں کر رہا وہ اللہ کے ساتھ کیے ہوئے عہد کو کہاں خاطر میں لائے گا! چنانچہ یہ ایمان اور دین کے عملی تقاضے ہیں جنہیں نبی کریمﷺ نے خوبصورتی سے بیان کر دیا۔

خطبے کے آخری حصے میں عام طور پر چند دعائیں شامل ہوتی ہیں۔

☆ اَللّٰھُمَّ انْصُرِ الْاِسْلَامَ وَالْمُسْلِمِیْنَ: ''اے اللہ! نصرت فرما اسلام کی اور مسلمانوں کی بھی''۔

☆اَللّٰھُمَّ انْصُرْ مَنْ نَصَرَ دِیْنَ مُحَمَّدٍ ﷺ وَاجْعَلْنَا مِنْھُمْ :''اے اللہ! ہر اُس شخص کی مدد فرما جو حضرت محمد ﷺ کے (لائے ہوئے) دین کی مدد میں لگا ہوا ہے اور ہمیں بھی ان میں شامل فرما''۔ جو لوگ بھی دین حق کو پورے کرۂ ارضی پر قائم کرنے کی جدوجہد میں لگے ہوئے ہیں' وہ سب اس دعا میں شامل ہیں۔ دعا کے آخری الفاظ بتا رہے ہیں کہ دعا کرنے والے کا اپنا ارادہ اور نیت بھی ہونی چاہیے کہ وہ بھی ایسے لوگوں کے ساتھ شامل ہو کر اللہ اور رسولؐ کے دین کی نصرت کے اس عظیم مشن میں اپنا حصہ ڈالے اور اس راستے کی رکاوٹوں کو دور کرنے کی امکانی کوشش کرے۔

☆وَاخْذُلْ مَنْ خَذَلَ دِیْنَ مُحَمَّدٍ/ اَعْرَضَ عَنْ دِیْنِ مُحَمَّدٍ ﷺ: یہاں دو الفاظ لائے جاتے ہیں: ''اور ہر اُس شخص کو ذلیل و رسوا کر دے جو دین محمد ﷺ کو رسوا کر رہا ہو' یا جو دینِ محمد ﷺ سے اعراض کرے۔''

☆وَلَا تَجْعَلْنَا مِنْھُمْ :''اور ہمیں ان لوگوں کے ساتھ کبھی شریک نہ کیجیو' ہم کبھی غلطی سے بھی ان لوگوں کے ساتھی نہ بن جائیں جو حضرت محمد ﷺ کے لائے ہوئے دین کی رسوائی کا موجب بن رہے ہوں۔ درحقیقت اسلام کی رسوائی یہود کے دل کی آرزو ہے۔ لہٰذا ان کے کہنے پر جو کچھ کیا جائے گا' وہ اس دینِ محمد ﷺ کی رسوائی کا سامان ہوگا۔ چنانچہ آج ہماری حکومت یہود و نصاریٰ کے دباؤ میں آ کر اسلام کے جہادی تصور اور دینی اقدار کا جو حلیہ بگاڑ رہی ہے تو یہ دراصل دین محمد ﷺ کو رسوا کرنے کا موجب بن رہی ہے اور اللہ کے غضب کو دعوت دے رہی ہے۔

☆عِبَادَ اللّٰہِ' رَحِمَکُمُ اللّٰہُ' اِتَّقُوا اللّٰہَ:''اے اللہ کے بندو! اللہ تم پر رحم فرمائے' اللہ کا تقویٰ اختیار کرو''۔ اللہ سے ڈرو' اصل قوت وہی ہے۔ اصل سپریم پاور وہی ہے۔

اس کے بعد سورۃ النحل کی آیت ۹۰ کی تلاوت کی جاتی ہے۔ اسے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے خطبہ جمعہ میں شامل کیا اور ان کے دَور سے اب تک یہ اس کا حصہ چلی

آ رہی ہے۔اس آیت کا شمار قرآن مجید کی جامع ترین آیات میں ہوتا ہے:

☆اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَاۗءِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاۗءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ۝

اس آیت کے بارے میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے' فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر خیر اور شر' یعنی وہ تمام باتیں کہ جن کو کرنے کا حکم ہے اور ہر وہ چیز جس سے منع کیا گیا ہے' ان سب کو جامعیت کے ساتھ اس ایک آیت میں سمو دیا ہے۔گویا یہ قرآن حکیم کی عظیم ترین آیات میں سے ہے۔سورۃ النحل ہی میں قرآن کی شان میں یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾ کہ اس میں ہر چیز کی وضاحت موجود ہے۔بعض علماء نے کہا کہ یہ آیت اس دعوے کی ایک بہت بڑی گواہی اور ایک واضح ثبوت ہے۔

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے پہلے تین اوامر کا ذکر فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَاۗءِ ذِي الْقُرْبٰى﴾ ''اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے عدل کا' احسان کا اور رشتہ داروں کے حقوق ادا کرنے کا''۔اسی طرح تین چیزوں سے منع کر دیا: ﴿وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاۗءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ﴾ ''اور اللہ منع کرتا ہے بے حیائی کے کاموں سے' تمام منکرات سے اور سرکشی وطغیانی سے۔'' جس چیز کو فطرتِ انسانی ناگوار محسوس کرتی ہے یا وہ کام جس کے کرنے سے آپ کا ضمیر ملامت کرتا ہے' وہ سب چیزیں منکرات میں شامل ہیں۔اور اپنی حدود کو پھلانگنا اور دوسرے کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنا سرکشی ہے۔

اب اس آیت کی تشریح کی طرف آتے ہیں۔تفسیر عثمانی میں علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ ''عدل کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کے تمام عقائد' اعمال' اخلاق' معاملات' جذبات' اعتدال وانصاف کے ترازو میں تلے ہوں' افراط و تفریط سے کوئی پلہ جھکنے یا اٹھنے نہ پائے۔سخت سے سخت دشمن کے ساتھ بھی معاملہ کرے تو انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔اس کا ظاہر و باطن یکساں ہوں۔جو بات اپنے لیے پسند نہ کرتا ہو اپنے بھائی کے لیے بھی پسند نہ کرے''۔یہ ہے پہلا لفظ: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ﴾ کہ اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے عدل کا! اور عدل ان تمام

پہلوؤں کو محیط ہے۔

عقائد میں عدل کیا ہے؟ اس کائنات میں سب سے بڑی حقیقت ''توحید'' ہے جو عقلی طور پر بھی ثابت ہے۔ جتنا زیادہ انسان مشاہدہ کرے گا اس کون ومکاں میں' زمین وآسمان میں اور مظاہر فطرت میں تو ایک بات لازماً پختہ ہوگی۔ وہ یہ ہے کہ کوئی ایک حکمت' کوئی ایک ارادہ' کوئی ایک اختیار ہے جو اس تمام نظام کے پیچھے کارفرما ہے۔ سورۃ الانبیاء میں بڑے سادے انداز میں اللہ تعالیٰ نے اس کو بیان فرمایا: ﴿لَوۡ كَانَ فِيۡهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا﴾ (آیت ۲۲) ''آسمانوں اور زمین میں اگر ایک سے زیادہ الٰہ (معبود) ہوتے' (ایک سے زائد بااختیار ہستیاں ہوتیں) تو یہاں فساد برپا ہو جاتا''۔ اگر مختلف خالق ہوتے تو ہر ایک اپنی مخلوق کو لے کر کائنات کے تخت حکومت پر قبضہ کرنے کے لیے زور آزمائی کرتا' کھینچ تان ہوتی' اقتدار کی رسہ کشی ہوتی۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی جتنی آگے بڑھے گی' اتنی ہی یہ بات پختہ ہوگی کہ اس سارے نظامِ کائنات میں ایک ہی حکمت' ایک ہی ارادہ' ایک ہی مشیت اور ایک ہی اختیار کارفرما ہے۔ اس حقیقت کا اقرار عقیدے اور نظریے کا عدل ہے اور اس سب سے بڑی حقیقت کا انکار سب سے بڑی ناانصافی ہے' جسے شرک کہا جاتا ہے۔ اسی لیے قرآن میں صاف اعلان کر دیا گیا: ﴿اِنَّ الشِّرۡكَ لَظُلۡمٌ عَظِيۡمٌ ﴿۱۳﴾﴾ (لقمان) ''شرک سب سے بڑا ظلم ہے''۔ یہ سب سے بڑی ناانصافی ہے' کیونکہ اتنی جلی حقیقت کا انکار کرنا دراصل اللہ کے معاملے میں ظلم وزیادتی کے مترادف ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے صاف فرما دیا کہ مشرک کی کوئی بخشش نہیں۔ ہاں موت سے پہلے اگر اس نے توبہ کر لی اور توحید پر آ گیا' تو اللہ تعالیٰ بخش دے گا' لیکن اگر اسی شرک کے ساتھ مر گیا تو وہاں اس کے لیے کوئی معافی نہیں۔ یہ ضابطہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ النساء میں دو مرتبہ بیان فرمایا ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغۡفِرُ اَنۡ يُّشۡرَكَ بِهٖ وَيَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ ذٰلِكَ لِمَنۡ يَّشَآءُ﴾ (آیت ۴۸ و ۱۱۶) ''اللہ تعالیٰ اس کو ہرگز نہیں بخشے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور اس کے سوا جس گناہ کو چاہے گا بخش دے گا''۔ یہ ظلم کی وہ شکل ہے

کہ اس کے لیے کوئی معافی نہیں' اور ہونی بھی نہیں چاہیے' کیونکہ انسان کو اللہ نے اشرف المخلوقات بنایا' مسجودِ ملائک بنایا' اسے عقل عطا کی اور اسے سماعت و بصارت دی' اسے شعور دیا اور وہ اتنی بڑی حقیقت کا انکار کر رہا ہے' ڈھٹائی کے ساتھ جھٹلا رہا ہے۔ ایسے شخص کے لیے کوئی معافی نہیں ہے۔ ہاں اس سے کم تر گناہوں میں سے جس کو چاہے گا' بخش دے گا' یہ اس کی اپنی صوابدید اور ضابطہ ہے۔ البتہ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انسان اس سے کم تر گناہوں پر جری ہو جائے کہ وہ تو بخش ہی دیے جائیں گے۔ بہر حال عقائد میں عدل توحید کا اقرار ہے کہ اللہ ایک ہے' تنہا ہے' کوئی اس کا ساجھی اور شریک نہیں' کوئی اس کا ہمسر نہیں۔ اس عقیدے میں عدم اعتدال کا نام شرک ہے۔

اس سے آگے چلیے' اعمال میں عدل کیا ہوگا؟ جب اللہ کو مان لیا اور اللہ سے عہد کیا: ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ ''اے پروردگار! ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور ہمیشہ کریں گے'' تو اب عدل کا تقاضا ہے کہ اس عہد کو پورا کیا جائے۔ حقوق اللہ بھی ادا ہوں اور حقوق العباد بھی۔ جن چیزوں کو اللہ نے فرض اور واجب قرار دیا' اگر اس میں ہم نے ڈنڈی ماری تو عدل سے پھر گئے۔ جو فرائض اور واجب اللہ کی طرف سے معین ہو چکے ہیں' اس میں کمی کا ہمارے پاس کوئی اختیار نہیں ہے۔ کوئی شخص کہے کہ میں نماز تو نہیں پڑھتا اور بہت سے نیک کام کرتا ہوں تو وہ عدل کی پٹڑی سے اترا ہوا ہے۔ اعمال میں عدل یہ ہوگا کہ تمام فرائض اور واجبات کو ادا کرنا' اور جو حرام کام ہیں' یعنی جن اُمور سے روک دیا گیا ہے' ان سے باز آ جانا۔ یہ عدل کا تقاضا ہے۔

معاملات میں عدل کیا ہوگا؟ آپس کے معاملات میں توازن کی روش اختیار کرنا۔ مثلاً کسی سے جو وعدہ کیا ہے اُسے پورا کیا جائے' کسی سے کوئی امانت کا معاملہ ہے تو اس میں خیانت نہ کی جائے۔ عدل کے مضمون کو قرآن مجید میں آخری منطقی انتہا تک پہنچایا گیا ہے' چنانچہ سورۃ النساء میں فرمایا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ﴾ ''اے اہل ایمان! عدل و انصاف کو قائم کرنے والے اور اللہ

کے گواہ بن کر کھڑے ہو جاؤ''۔ کس حد تک عدل و انصاف پر قائم رہنا ہے' فرمایا: ﴿وَلَوْ عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ اَوِالْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ﴾ (آیت ۱۳۵) ''اگر (عدل و انصاف کی بات) خواہ تمہارے اپنے خلاف یا تمہارے والدین کے خلاف یا تمہارے رشتہ داروں کے خلاف بھی جاتی ہو تب بھی عدل پر قائم رہو''۔ اس لیے کہ انسان بالعموم یہاں پر ڈنڈی مار جاتا ہے۔ وہ اپنے تولنے کے باٹ کچھ اور رکھتا ہے اور دوسروں کو کسی اور باٹ سے تولتا ہے۔ معاملات میں عدل یہ ہے کہ سب کو ایک ہی باٹ سے تولو۔ اگر محبت ہے تو اس کی وجہ سے ڈنڈی نہ مار جانا۔ اگر کوئی بات رشتہ داروں کے خلاف جاتی ہو' خود اپنے خلاف جاتی ہو' یا والدین کے خلاف جاتی ہو' بہرصورت حق کا ساتھ دیا جائے۔ یہ نہیں ہے کہ چونکہ فلاں ہمارا رشتہ دار ہے' ہماری پارٹی کا ہے لہٰذا خواہ وہ حق پر نہ بھی ہو تب بھی اسی کے پلڑے میں وزن ڈالنا ہے۔ یہ عدل نہیں ہے۔ عدل وہ ہے جو حضور ﷺ نے قائم کر کے دکھایا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ غیر مسلم بھی آپؐ کی عدالت میں فیصلے کرانے آتے تھے۔ قرآن حکیم نے اس معاملے کے دوسرے رُخ کو بھی واضح کر دیا کہ کسی کی دشمنی کی وجہ سے بھی تم عدل و انصاف سے نہ ہٹ جانا۔ فرمایا: ﴿یٰٓاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰہِ شُہَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا ط﴾ (المائدۃ:۸) ''مسلمانو! کھڑے ہو جاؤ اللہ کے لیے عدل و انصاف کے گواہ بن کر' اور دیکھنا کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم راہ عدل سے ہٹ جاؤ''۔ یہ ہے معاملات کا عدل۔

اخلاقیات میں عدل کیا ہوگا؟ ایک دوسرے کا احترام' ایک دوسرے کی عزت۔ کسی کی عزتِ نفس پر حملہ نہ کیا جائے' ہر ایک کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا جائے۔ لیکن اگر کوئی آپ کی عزتِ نفس پر حملہ کرتا ہے' آپ کے ساتھ زیادتی کرتا ہے تو عدل کا تقاضا یہ ہے کہ آپ بھی اتنا ہی بدلہ لیں' اس سے تجاوز نہ کریں۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثْلُہَا﴾ (الشوریٰ:۴۰) قرآن نے یہ اصول دے دیا کہ ''برائی کا بدلہ اس جیسی برائی ہے''۔ یعنی تمہارے ساتھ کوئی زیادتی کرے تو تم بھی اسی

E:\Ms-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq october05\ms25-07 khutba-e-juma-2.inp 8/22/2014 4:52 PM PAGE 7 (1,1)

کے مثل‘ جتنی اس نے زیادتی کی ہے‘ اس کے ساتھ زیادتی کر سکتے ہو‘ اس سے زیادہ کا تمہیں کوئی حق نہیں۔ اس حوالے سے سورۃ المائدۃ کی یہ آیت بڑی مشہور ہے:
﴿وَکَتَبۡنَا عَلَیۡہِمۡ فِیۡہَاۤ اَنَّ النَّفۡسَ بِالنَّفۡسِ وَالۡعَیۡنَ بِالۡعَیۡنِ وَالۡاَنۡفَ بِالۡاَنۡفِ وَالۡاُذُنَ بِالۡاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالۡجُرُوۡحَ قِصَاصٌ ؕ﴾ (آیت ۴۵) یعنی کسی نے آنکھ پھوڑی ہے تو جواباً اس کی آنکھ پھوڑی جا سکتی ہے‘ دانت توڑا ہے تو دانت توڑا جا سکتا ہے‘ جس طرح کا زخم لگایا اس کے بدلے میں زخم لگانے والے کو اسی طرح کا زخم لگایا جائے گا۔ یہ ہے عدل! اگرچہ احسان اس میں کیا ہے؟ وہ ہے معاف کر دینا۔ اس کا ذکر بعد میں آئے گا۔

اب آگے آیئے! جذبات میں بھی عدل مطلوب ہے۔ انسانی جذبات کی بہت سی صورتیں ہیں۔ غصہ بھی ایک جذبہ ہے‘ اس میں بھی عدل چاہیے۔ انسان غصے سے بالکل پاک ہو جائے یہ بھی کوئی مطلوب شے نہیں ہے۔ اس طرح غیرت وحمیت بھی ختم ہو جائے گی۔ اگر ایک مؤمن دیکھ رہا ہے کہ شریعت کے اصول اور احکام پامال ہو رہے ہیں‘ دینی قدروں کی دھجیاں بکھیری جا رہی ہیں تو اس پر اس کا خون کھولنا چاہیے‘ چہرے کا رنگ تو متغیر ہونا چاہیے۔ لیکن اس صورتِ حال میں عدل کیا ہوگا؟ عدل اس میں یہ ہے کہ اس نظام کو بدلنے کے لیے آنحضورﷺ نے جو طریقہ کار اختیار فرمایا‘ اس پر عمل پیرا ہوا جائے۔ یہ نہیں کہ ایک دفعہ نکلے‘ چند نعرے لگائے اور اپنے جذبات کا اظہار کر کے فارغ ہو گئے‘ گویا ہم نے حق ادا کر دیا۔ بہرحال غصے کے اندر بھی اعتدال کی ضرورت ہے‘ اور اس کے لیے ہمیں سیرتِ رسولؐ اور سیرت صحابہؓ سے رہنمائی لینی ہوگی۔ یعنی غصہ میں انسان بے قابو نہ ہو جائے‘ بلکہ اس کا اظہار صحیح جگہ پر اور صحیح طریقے پر ہو۔

اسی طرح نیکی بھی ایک جذبہ ہے‘ اس میں بھی اعتدال مطلوب ہے۔ حضورﷺ نے اس کی بھی مثالیں قائم فرمائیں اور اُمت کو تعلیم دی۔ ایک صحابیؓ نے کہا کہ میں انفاق فی سبیل اللہ کرنا چاہتا ہوں۔ ان میں نیکی کا جذبہ اتنا بیدار ہوا کہ کہنے لگے میں اپنا

سب کچھ اللہ کی راہ میں دینا چاہتا ہوں۔ آنحضورﷺ نے ان کی اس پیشکش کو قبول نہیں کیا' بلکہ فرمایا کہ اپنی اولاد اور ورثاء کے لیے بھی تو کچھ رکھو۔ یہ نہ ہو کہ کل تمہاری اولاد دست سوال دراز کرتی پھرے۔ انہوں نے کہا کہ میں آدھا دے دیتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: یہ بھی قبول نہیں۔ پھر انہوں نے کہا: ایک تہائی دے دیتا ہوں۔ آپﷺ نے فرمایا: ہاں یہ قبول ہے اور یہ بھی بہت ہے۔ یہ ہے نیکی میں اعتدال۔ اس ضمن میں تین صحابہؓ کا واقعہ نہایت اہم ہے۔ ان پر نیکی کا بڑا غلبہ ہوا۔ اُمہات المؤمنین رضی اللہ عنہن میں سے بعض کی خدمت میں وہ حاضر ہوئے اور آنحضورﷺ کی نفلی عبادات کے بارے میں سوال کیا کہ آپؐ رات کو کتنا قیام کرتے ہیں؟ نفلی روزے کتنے رکھتے ہیں؟ وغیرہ۔ انہیں بتایا گیا کہ آنحضورﷺ کچھ وقت رات کا آرام بھی کرتے ہیں اور رات کا ایک بڑا حصہ کھڑے بھی رہتے ہیں۔ آپؐ نفلی روزے بھی رکھتے ہیں اور ناغے بھی کرتے ہیں۔ کبھی نفلی روزے رکھتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ اب شاید مسلسل ہی رکھیں گے اور کئی دفعہ ناغہ کرنے پر آتے ہیں تو مسلسل ناغہ ہوتا ہے۔ جو صورت حال تھی وہ ازواج مطہراتؓ نے سامنے رکھ دی۔ حدیث میں الفاظ آتے ہیں کہ اُن تینوں نے اپنے خیال میں اسے کم تصور کیا۔ وہ اس سے زیادہ کی توقع لیے ہوئے تھے۔ لیکن ساتھ ہی اپنے آپ کو قائل کیا کہ چونکہ آنحضورﷺ معصوم عن الخطا ہیں اور اگر کسی درجے میں خطا کا کوئی امکان ہو بھی تو قرآن میں یہ بات آ گئی کہ آپﷺ کی اگلی پچھلی سب خطائیں معاف ہیں' لہٰذا آپؐ کے لیے تو اتنا کافی ہے' لیکن ہمیں اس سے کچھ بڑھ کر کرنا پڑے گا۔ چنانچہ ایک نے طے کر لیا کہ میں تو ساری عمر شادی نہیں کروں گا' بس اللہ سے لو لگاؤں گا۔ دوسرے نے طے کیا کہ میں ساری رات کھڑا رہوں گا' اپنی کمر بستر سے نہیں لگاؤں گا۔ تیسرے نے طے کر لیا کہ میں ہمیشہ روزے رکھوں گا' کوئی ناغہ نہیں کروں گا۔ اب بظاہر یہ نیکی کا جذبہ اور خیر کا کام ہے اور بڑے اُونچے عزائم ہیں' لیکن اعتدال دیکھئے جو حضورﷺ نے اُمت کو تلقین فرمایا۔ آپﷺ کے علم میں جب یہ بات آئی تو آپؐ نے ان تینوں کو بلایا' اس لیے کہ اس معاملے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا'

کیونکہ اس سے غلط روایت پڑ سکتی تھی۔ آپؐ کے چہرے سے بھی اس روش پر ناراضگی کا اظہار ہو رہا تھا اور آپؐ کے الفاظ سے بھی ناراضگی واضح ہوتی ہے۔ فرمایا: ((وَاللّٰہِ اِنِّیْ لَاَخْشَاکُمْ لِلّٰہِ وَاَتْقَاکُمْ لَہٗ)) ''اللہ کی قسم! میں تم میں سے سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے والا ہوں''۔ یہ غیر معمولی الفاظ ہیں' لیکن اس معاملے کی اہمیت کو سمجھانے کے لیے آنحضورﷺ نے یہ انداز اختیار فرمایا۔ اس کے ساتھ ہی آپﷺ نے ارشاد فرمایا: ((لٰکِنِّیْ اَصُوْمُ وَاُفْطِرُ وَاُصَلِّیْ وَاَرْقُدُ وَاَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ ' فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ))(۱) ''لیکن میں (نفلی) روزے رکھتا بھی ہوں اور ناغہ بھی کرتا ہوں' (رات کو) نماز (تہجد) بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں' اور میں نے عورتوں سے شادیاں بھی کی ہیں۔ پس جسے میرا طریقہ پسند نہیں ہے (جو مجھ سے بھی آگے جانے کی کوشش کر رہا ہے) اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں''۔ اسلام یہ تعلیم نہیں دیتا کہ انسان اپنے نفس کو کچل ڈالے اور اس دنیا سے بالکل کٹ جائے۔ ہمارے دین کی رہبانیت ایک ہی ہے' اور وہ جہاد و قتال کے لیے گھر بار چھوڑ کر نکلنا ہے۔ اس میں ظاہر بات ہے کہ وقتی طور پر انسان گھر بار چھوڑتا ہے اور جان ہتھیلی پر رکھ کر جاتا ہے۔ دنیا کو ترک کرنے کی صرف یہ شکل ہے کہ جو اللہ کو پسند ہے کہ آدمی جہاد و قتال کے لیے' غلبہ دین کے لیے گھر بار سے نکلے۔ لیکن نیکی میں بھی عدل و اعتدال ضروری ہے اور اس معاملے میں ہمارے لیے اُسوۂ کامل نبی کریمﷺ کی سیرتِ طیبہ ہے۔

یہاں تک بات ہوئی عدل کی کہ کس طرح عقائد' اعمال' اخلاقیات اور جذبات میں عدل کی ضرورت ہے' اور صرف ایک لفظ ''عدل'' میں کتنی وسعت ہے۔ اس آیت میں دوسرا حکم اللہ نے احسان کا دیا۔ احسان کیا ہے؟ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے اپنی تفسیر میں بہت جامعیت کے ساتھ اس کی بھی وضاحت فرما دی کہ ''انسان بذاتِ خود نیکی اور بھلائی کا پیکر بن کر دوسروں کا بھلا چاہے' مقامِ عدل و انصاف سے ذرا اور بلند ہو کر'

(۱) صحیح البخاری' کتاب النکاح' باب الترغیب فی النکاح۔

فضل وعفو اور تلطف و ترحم کی خو اختیار کرے۔ فرض ادا کرنے کے بعد تطوع و تبرع کی طرف قدم بڑھائے''۔ میں اس کی وضاحت کرتا ہوں۔ فضل کیا ہے؟ ایک شخص سے آپ نے طے کیا کہ وہ آٹھ گھنٹے کام کرے گا اور اس کی مزدوری سو روپے ہوگی۔ عدل یہ ہے کہ اس نے آٹھ گھنٹے کام کیا تو آپ نے سو روپے اس کو دے دیے۔ احسان کیا ہے؟ یہ دیکھتے ہوئے کہ کام اچھا کیا ہے' محنت سے کیا ہے' آپ اس کی اجرت دیتے ہوئے مزید اپنی طرف سے دس بیس روپوں کا اضافہ کر دیں' یہ احسان ہے۔ میں نے عدل کے معاملے میں وضاحت کرتے ہوئے یہ الفاظ کہے تھے کہ تمام فرائض اور واجبات کو ادا کرنا عدل کا تقاضا ہے۔ اس پر نفل کا جو اضافہ ہوگا وہ احسان ہے۔ فرض نماز کے علاوہ سنتیں اور نوافل بھی ادا کرے۔ فرض روزے کے علاوہ بھی روزے رکھے۔ انفاق کے ضمن میں عدل یہ ہوگا کہ ٹھیک ٹھیک زکوٰۃ ادا کی جائے۔ اس سے زیادہ اگر وہ اللہ کے دین اور اس کی مخلوق پر خرچ کر رہا ہے تو یہ احسان ہے۔

اس سے آگے تفسیر عثمانی میں یہ الفاظ ہیں کہ احسان یہ ہے کہ ''انصاف کے ساتھ مروّت کو جمع کرے اور یقین رکھے کہ جو کچھ بھلائی وہ کرے گا اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔ ادھر سے بھلائی کا جواب ضرور بھلائی کی صورت میں ملے گا''۔ یہ ساری بات اللہ سے عہدِ بندگی کے حوالے سے ہو رہی ہے۔ ہم نے اللہ کو اپنا رب مانا ﴿اِیَّاکَ نَعۡبُدُ﴾ اور اقرار کیا کہ اسی کو اپنا مشکل کشا اور حاجت روا سمجھیں گے۔ ﴿وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ﴾ اور یہ مانا کہ قرآن اس کا کلام ہے' اس کی دی ہوئی ہدایت ہے۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ اصل منزل آخرت ہے' یہ دنیا دارالامتحان ہے' اب میں جتنا زیادہ کروں گا' اتنا بدلہ پاؤں گا۔ ایک تو فرض اور واجب ہے جس کے بارے میں باز پرس ہوگی' اس سے زیادہ جو کچھ کر رہا ہوں یقیناً اس کے بدلے وہاں زیادہ ملے گا۔ یہ احسان کی روش ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿هَلۡ جَزَآءُ الۡاِحۡسَانِ اِلَّا الۡاِحۡسَانُ ﴿۶۰﴾﴾ (الرحمٰن)

عقائد اور ایمان کے اعتبار سے بھی احسان کی تعریف حدیث میں آئی ہے۔ عدل تو یہ ہے کہ انسان شرک سے بچ جائے' توحید پر کاربند رہے۔ لیکن یہ توحید یعنی اللہ پر

ایمان‘ یقین اور توکل جب اس درجے کا ہو جائے کہ ((اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ ‘ فَاِ لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ(۱)) یعنی ’’تم اللہ کی بندگی ایسے کرو کہ گویا تم اللہ کو دیکھ رہے ہو‘‘ (ہر وقت اللہ کی موجودگی کا احساس رہے) پھر اگر تم اسے نہیں دیکھ سکتے تو (کم از کم یہ احساس ہر وقت رہے کہ) وہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے‘‘۔ تو یہ درجۂ احسان ہے۔ اس جذبے کے ساتھ انسان جو بھی بندگی کرے گا‘ اس میں خوبصورتی اور نکھار پیدا ہوگا۔ نماز فرض ہے‘ اگر آپ نماز پڑھتے ہیں اس احساس کے ساتھ کہ میں اس وقت اللہ کی نگاہ میں ہوں اور میں اللہ سے ہم کلام ہوں تو اس نماز میں جو حسن پیدا ہوگا وہ درجہ احسان کا ہے۔

معاملات میں بھی احسان کا معاملہ ہوتا ہے۔ کسی شخص سے آپ نے قرض لیا اور اس میں اگر طے کر لیا کہ واپسی اضافے کے ساتھ ہوگی تو یہ سود ہے اور انتہائی سنگین اور بھیانک جرم ہے۔ جبکہ عدل یہ ہے کہ جتنا قرض آپ نے کسی کو دیا تھا‘ اتنا ہی واپس لیں‘ جتنا کسی سے لیا ہے اتنا ہی واپس کریں۔ لیکن اس میں احسان کیا ہے؟ حضور ﷺ کا معمول تھا کہ کسی سے کچھ قرض لیتے واپس لوٹاتے ہوئے اپنی مرضی سے اس میں کچھ بڑھا دیتے تھے۔ طے نہیں تھا کہ بڑھانا ہے۔ یہ تطوع ہے۔ یعنی تم ایک مشکل وقت میں میرے کام آئے تھے‘ میں اپنی مرضی سے تم کو اضافی رقم دے رہا ہوں۔ یہ معاملات کے اندر احسان کی شکلیں ہیں۔

اس آیت میں تیسری بات یہ فرمائی: ﴿وَاِیْتَآءِ ذِی الْقُرْبٰی﴾ ’’(اللہ حکم دیتا ہے) رشتہ داروں کو (اُن کے حقوق) ادا کرنے کا‘‘۔ قریبی رشتہ دار دوسرے لوگوں کے مقابلے میں زیادہ مستحق ہیں۔ یہ کام زیادہ مشکل ہوتا ہے‘ اس لیے کہ عام طور پر قریبی عزیزوں کے ساتھ شکوے شکایتیں بھی ہوتی ہیں۔ چوتھے محلے جا کر خیرات بانٹنا آسان ہے۔ یہ صلہ رحمی کا حکم ہے کہ رشتہ داروں‘ والدین‘ بہن بھائیوں کے ساتھ بھلائی کرو۔ محلے داروں‘ پڑوسیوں اور دوسرے مسلمانوں کے حقوق کی ادائیگی دراصل

---

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب الایمان‘باب سؤال جبریل النبی ﷺ عن الایمان والاسلام والاحسان۔ وصحیح مسلم‘ کتاب الایمان‘ باب بیان الایمان والاسلام والاحسان۔

عدل واحسان کے تحت آتی ہے' لیکن رشتہ داروں کی اہمیت سب سے بڑھ کر ہے' عدل و احسان میں ان کو مقدم رکھا جانا چاہیے' اس لیے اس کو علیحدہ سے نمایاں کر دیا۔

یہ تین باتیں ہیں جن کا اللہ نے حکم دیا۔ اس کے بعد تین سے منع فرمایا۔ ارشاد ہوا:

﴿وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ﴾ فَحْشَاء سے مراد ہر قسم کی فحش بات اور بے حیائی ہے۔ شیطان اس راستے سے انسان کو صراطِ مستقیم سے بچلاتا اور راہِ حق سے منحرف کرتا ہے۔ ''منکر'' ہر وہ شے ہے جو معروف کے خلاف ہو۔ فطرتِ انسانی جس سے کراہت محسوس کرے' جسے ناگوار محسوس کرے' ایسی سب چیزیں منکرات میں شامل ہیں۔ کسی کا دل دکھانا' کسی کو دھوکا دینا' بدعہدی کرنا' امانت میں خیانت کرنا' جھوٹ بولنا' غلط بیانی کرنا' کسی کا مذاق اڑانا' ملاوٹ کرنا' سود اور جوا یہ سب منکرات ہیں' ان سے روک دیا گیا۔

''وَالْبَغْيِ'' سے ہر قسم کی طغیانی اور سرکشی مراد ہے۔ کسی دوسرے کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنا' والدین کے سامنے سر اٹھانا' اساتذہ کی بے ادبی کرنا' یہ سب طغیانی اور سرکشی کی شکلیں ہیں۔ طغیانی کی سب سے بڑی شکل وہ اجتماعی نظام ہے جو اللہ کی بغاوت پر مبنی ہے' جو آج پوری دنیا میں رائج ہے۔ اِس وقت دنیا میں اللہ کے خلاف بغاوت' سرکشی اور طغیانی کا معاملہ اپنے عروج پر ہے۔ سیاسی سطح پر سیکولرازم دراصل ''اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى'' کا نعرہ ہے کہ ہم نہیں مانتے کہ کوئی اللہ ہے' کوئی خالق و مالک ہے' اگر ہے بھی تو وہ وہیں آسمانوں میں رہے۔ زمین میں اپنا نظام' اپنا دستور اور اپنے قوانین ہم خود بنائیں گے' یہاں ہمیں اللہ کی مداخلت ہرگز گوارا نہیں ہے۔ یہ ہے سیکولر نظام۔ اسی طرح معیشت میں سود کا نظام ہے' جس کے بارے میں قرآن میں ہے کہ اگر سود نہیں چھوڑتے تو اللہ اور رسولؐ کی طرف سے اعلانِ جنگ ہے۔ آج پوری دنیا نے سود اختیار کیا ہوا ہے۔ اللہ اور رسولؐ کے خلاف محاذِ جنگ دانستہ طور پر کھولا گیا ہے۔ یہ ہے طغیانی اور سرکشی۔ معاشرتی سطح پر آ جائیں۔ بے حیا مادر پدر آزاد معاشرت' تہذیب اور کلچر عام ہے۔ یہ شیطانی تہذیب ہے' کیونکہ فحاشی شیطان کا ہتھکنڈہ ہے' جسے قرآن

نے بایں الفاظ واضح کیا : ﴿اَلشَّیۡطٰنُ یَعِدُکُمُ الۡفَقۡرَ وَیَاۡمُرُکُمۡ بِالۡفَحۡشَآءِ﴾ (البقرۃ:۲۶۸) ''یہ شیطان ہے جو تمہیں فقر سے ڈراتا ہے (اور اس طرح انفاق سے روکتا ہے) اور حکم دیتا ہے تمہیں فحشاء کا''۔ یہ شیطانی کلچر ہے جو آج ہمارے گھروں تک پہنچا ہوا ہے' وہ کیبل کی شکل میں ہو یا کسی اور شکل میں ہو۔ ہم انفرادی طور پر بھی فحاشی کو فروغ دے رہے اور ہمارے حکمرانوں نے بھی ہر چیز کے دروازے کھول دیے ہیں۔ شیطانی تہذیب ہو یا شیطانی نظام' آج تمام دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ اس نظام اور کلچر کو خوش آمدید کہا جا رہا ہے۔ بہرحال جن چیزوں سے اللہ نے روکا ہے انہیں ہم سینہ زوری کے ساتھ اختیار کیے ہوئے ہیں۔ ان سے بچنا ضروری ہے۔

آگے فرمایا: ﴿یَعِظُکُمۡ لَعَلَّکُمۡ تَذَکَّرُوۡنَ ﴿۹۰﴾﴾ ''اللہ تمہیں نصیحت کر رہا ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو (ہوش میں آؤ)'' یہ ساری باتیں اس لیے بیان نہیں کی گئی ہیں کہ انہیں ایک کان سے سنو اور دوسرے سے نکال دو' یا ان کو محض اجر و ثواب کے لیے پڑھ لو' بلکہ ان سے فائدہ اٹھانے کے لیے ضروری ہے کہ جن کاموں سے روکا گیا ان سے رک جاؤ اور جن کو کرنے کا حکم دیا گیا ان کو انجام دو۔ اگر تم مسلمان ہو تو یہ لازمی تقاضا ہے۔

اب اسی آیت کے تناظر میں ہم آج کے اپنے ماحول کو دیکھیں۔ ہم جشن بہاراں منانے چلے ہیں جبکہ دنیا میں کیا حالات ہیں! انسانیت سسک رہی ہے۔ ''سونامی'' کی صورت میں عذاب الٰہی ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں' لیکن ہمارے لچھن وہی ہیں۔ کیا ہم بھی اللہ کے کسی عذاب کا انتظار کر رہے ہیں؟ سونامی طوفان کے ہاتھوں لاکھوں انسان لقمۂ اجل بنے' جن میں اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ یہ ایک نقشہ ہے۔ دوسرا نقشہ یہ ہے کہ امریکہ افغانستان اور عراق میں مسلمانوں کا قتل عام کر رہا ہے اور اب ایران پر حملے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ یہ دین سے دُوری اور اللہ کے دین کو قائم نہ کرنے کی سزا ہے کہ آج مسلمان ملکوں کی حالت ایسے ہے جیسے بھیڑوں میں سے کسی ایک بھیڑ کو پکڑ کر قصاب ذبح کرتا ہے' پھر دوسری کو' پھر تیسری کو' اور بھیڑیں اس قابل نہیں ہوتیں کہ اس قصاب کے خلاف مل کر کوئی مشترکہ لائحہ عمل مرتب کر سکیں اور اس کی

سفاکیت کے خلاف کھڑی ہوسکیں۔ بس وہ انتظار کر رہی ہوتی ہیں کہ اب کس کی باری ہے۔ یہی نقشہ ہمارا ہے۔ اب امریکہ کا رُخ ایران کی طرف ہے۔ پہلے خیال تھا کہ شام کی باری آئے گی' لیکن اس نے اپنا رُخ ایران کی طرف کرلیا ہے۔ اور یہ بات سب کو معلوم ہے جس وجہ سے وہ ایران آیا ہے' اس وجہ سے پاکستان میں آنا اس کا لازمی حصہ ہے۔ اس نیوکلیئر ٹیکنالوجی میں ہم ایران سے چار قدم آگے کھڑے ہیں۔ نیوکلیئر ٹیکنالوجی کسی مسلمان ملک کو مل جائے' یہود و نصاریٰ کو یہ قطعاً گوارا نہیں۔

دہشت گردی کے خلاف جو عالمی مہم ہے وہ دراصل اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہے۔ امریکی حکومت کے جو بیانات آج کل آ رہے ہیں ان میں اس بات پر شدید اندیشہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ پاکستان کی ایٹمی تنصیبات کہیں دہشت گردوں اور بنیاد پرستوں کے ہاتھ نہ چڑھ جائیں۔ امریکہ دراصل اسی بہانے کی آڑ میں پاکستان کی ایٹمی تنصیبات پر قبضہ کرنے کی منصوبہ بندی کر رہا ہے۔ وہ کبھی ہمارا خیر خواہ نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ اپنے ربّ کو راضی کر کے اس کی مدد حاصل کی جائے۔ لیکن ہمارے لچھن کیا ہیں؟ جشن بہاراں منایا جا رہا ہے' بسنت منائی جا رہی ہے' میراتھن ریس ہو رہی ہے' جبکہ اس وقت اس بڑے دشمن کے مقابلے میں قوم کو جگانے کی ضرورت ہے۔ لیکن ہمارا حال یہ ہے کہ ایک طرف ہم پانچ فروری کو کشمیریوں کے ساتھ یوم یکجہتی منانے کا عزم رکھتے ہیں تو دوسری طرف چھ فروری کو ہندوؤں کا تہوار بسنت منانے کی قومی سطح پر تیاریاں کر رہے ہیں۔ کیا ہم اللہ کے غضب کو دعوت نہیں دے رہے؟ بسنت تو ایک عنوان ہے' اس عنوان کی آڑ میں جو افراتفری اور فحاشی کا ارتکاب ہوتا ہے' ان سب کو آپ ذہن میں لائیے۔ کیا ہم اللہ کے غضب کو دعوت نہیں دے رہے؟ کیا ہم کسی سونامی کے منتظر ہیں؟ لہٰذا حکومت سے التماس ہے کہ وہ بسنت منانے اور جشن بہاراں کا انعقاد چھوڑ کر پتنگ کی ڈور کی فروخت پر مستقل پابندی عائد کرے اور علامہ اقبال اور قائداعظم کے تصورات کے مطابق مملکت خداداد پاکستان میں دین حق کے حقیقی قیام اور شریعت کے نفاذ پر کمربستہ ہو جائے۔ وگرنہ کوئی سونامی

یہاں بھی آئے گا اور اس وقت وہ مہلت ختم ہو چکی ہو گی جو ہمیں ملی ہوئی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم انفرادی اور اجتماعی سطح پر توبہ کریں اور اصلاحِ حال پر کمربستہ ہو جائیں۔ اس کا صرف اور صرف یہ طریقہ ہے کہ ہمارے حکمرانوں سمیت ہر شخص پہلے اپنی ذات پر اور پھر ملک میں حقیقی اسلام نافذ کرنے کے لیے سرگرم عمل ہو جائے۔

☆اُذْکُرُوا اللّٰہَ یَذْکُرْکُمْ وَادْعُوْہُ یَسْتَجِبْ لَکُمْ ''تم اللہ کو یاد رکھو وہ تمہیں یاد رکھے گا' اور تم اس سے دعا کرو وہ تمہاری دعا قبول کرے گا''۔ اللہ کو یاد رکھنا یہ بھی ہے کہ زبان سے اللہ کا ذکر ہو اور ایک شکل یہ ہے کہ ہر وقت اس بات کا خیال رہے کہ کہیں اللہ کا کوئی حکم تو نہیں ٹوٹ رہا۔ جب تم ایسا کرو گے تو اللہ بھی تمہیں بے کس و بے یار و مددگار نہیں چھوڑے گا۔

☆وَلَذِکْرُ اللّٰہِ تَعَالٰی اَعْلٰی وَاَوْلٰی وَاَھَمُّ وَاَکْبَرُ: ''اور یقیناً اللہ تعالیٰ ہی کا ذکر سب سے بلند' سب سے مقدم' سب سے اہم اور سب سے بڑا ہے''۔

☆وَاللّٰہُ یَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ: ''اور جو کچھ تم کرتے ہو' اللہ تعالیٰ اس سے باخبر ہے''۔

یہاں خطبہ جمعہ مکمل ہو گیا۔ اس خطبے کے ذریعے سے جو ہدایت اور موعظت ہمارے سامنے آئی ہے' اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہم اپنی زندگی کو اس کے مطابق استوار کر سکیں۔ آمین!

(ملخص: محمد خلیق)

ہے: ''یقیناً اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے عدل کا' احسان کا' رشتہ داروں کو (ان کے حقوق) دینے کا''۔ تمام اوامر چاہے وہ عقیدے سے متعلق ہوں یا عمل سے' ان تین عنوانات کے تابع آ جاتے ہیں۔ ''اور منع کرتا ہے بے حیائی سے' برائی سے اور سرکشی سے''۔ ''فحشاء'' میں بے حیائی کی وہ تمام شکلیں شامل ہیں جنہیں آج قومی سطح پر فروغ دیا جا رہا ہے۔ منکرات میں تمام غلط چیزیں جیسے جھوٹ' ملاوٹ' دھوکہ دہی' سود اور جوا شامل ہیں۔ والدین کے سامنے سر اٹھانا' اساتذہ کی بے ادبی کرنا بھی سرکشی ہے' لیکن اس کی سب سے سنگین شکل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قائم کردہ حدود سے آگے بڑھا جائے۔ اللہ کے حکم کو ایک طرف رکھ کر اپنی مرضی کے مطابق فیصلے کیے جائیں۔ ''وہ (اللہ تعالیٰ) تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم اس نصیحت سے فائدہ اٹھاؤ''۔ یہ ساری باتیں اس لیے بیان نہیں کی گئی ہیں کہ انہیں ایک کان سے سنو اور دوسرے سے نکال دو' یا ان کو محض اجر و ثواب کے لیے پڑھ لو بلکہ ان سے فائدہ اٹھانے کے لیے ضروری ہے کہ جن کاموں سے روکا گیا' ان سے رک جاؤ اور جن کو کرنے کا حکم دیا گیا' ان کو انجام دو۔ اگر مسلمان ہو تو یہ لازمی تقاضا ہے۔

☆ اُذْكُرُوا اللّٰهَ يَذْكُرْكُمْ وَادْعُوْهُ يَسْتَجِبْ لَكُمْ: ''تم اللہ کو یاد رکھو' وہ تمہیں یاد رکھے گا' اور تم اس سے دعا کرو' وہ تمہاری دعا قبول کرے گا''۔ اللہ کو یاد رکھنا یہ بھی ہے کہ زبان سے اللہ کا ذکر ہو اور ایک شکل یہ ہے کہ ہر وقت اس بات کا خیال رہے کہ کہیں اللہ کا کوئی حکم تو نہیں ٹوٹ رہا۔ جب تم ایسا کرو گے تو اللہ بھی تمہیں بے کس و بے

E:\Ms-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq october05\ma25-07 khutba-e-juma-2.inp 8/22/2014 4:52 PM PAGE 12 (1,1)

یارومددگارنہیں چھوڑے گا۔

☆وَلَذِکْرُ اللّٰہِ تَعَالٰی اَعْلٰی وَاَوْلٰی وَاَھَمُّ وَاَکْبَرُ:''اور یقیناً اللہ تعالیٰ ہی کا ذکر سب سے بلند' سب سے مقدم' سب سے اہم اور سب سے بڑا ہے''۔

☆وَاللّٰہُ یَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ: ''اور جو کچھ تم کرتے ہو' اللہ تعالیٰ اس سے باخبر ہے''۔

الحمدللہ کہ خطبہ جمعہ کا ترجمہ مکمل ہوگیا۔اس خطبے کے ذریعے سے جو ہدایت اور موعظت ہمارے سامنے آئی ہے' اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہم اپنی زندگی کو اس کے مطابق استوار کرسکیں۔آمین!(ملخّص: محمد خلیق)

والد کی ذمہ داریاں

سیرتِ انبیاءؑ اور قرآنی تعلیمات کی روشنی میں

تحریر: حافظ محبوب احمد خان

والدین کے لیے یہ انتہائی اہم معاملہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی اولاد کی پرورش کن خطوط پر کریں، انہیں کن چیزوں سے بچانے کی کوشش کرنی ہے اور کن چیزوں کے حصول کے لیے ترغیب دینی ہے۔ اور پھر یہ کہ اپنے جگر گوشوں کے بارے میں اپنی تمناؤں، آرزوؤں اور ارادوں کی تکمیل کیسے کریں اور انہیں نہ صرف دنیا میں آفات و مصائب اور مشکلات سے بچائیں بلکہ آخرت میں بھی ان کو کامیاب و کامران بنائیں۔

اُمت اسلامیہ پر اللہ ربّ العزت کے بے شمار احسانات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس نے اپنے کلام قرآن کریم میں اپنے جلیل القدر انبیاء علیہم السلام کی سیرت کے مختلف پہلوؤں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا ہے، تاکہ انسانیت ہر دَور میں ان سے رہنمائی حاصل کر سکے۔ جن باپ بیٹوں کا ذکر ہمیں قرآن کریم میں اس طور سے ملتا ہے کہ باپ بھی نبی اور بیٹا بھی نبی، ان میں حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کے جلیل القدر بیٹے حضرت یوسف علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام، حضرت زکریا علیہ السلام اور ان کے بیٹے حضرت یحییٰ علیہ السلام، حضرت داؤد علیہ السلام اور ان کے بیٹے حضرت سلیمان علیہ السلام شامل ہیں۔ ایسے باپ بیٹے کا ذکر بھی ہے کہ باپ نبی اور اولاد نافرمان، یعنی حضرت نوح علیہ السلام اور ان کا بیٹا، جبکہ ایک جوڑا ایسا بھی ہے کہ باپ نافرمان اور بیٹا نبی، یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کا والد آزر۔

ان شخصیات میں جہاں ایک جانب ہمیں ایک مثالی والد اور دوسری جانب مثالی اولاد کا تذکرہ ملتا ہے وہیں تربیت اولاد کے ضمن میں بھی قرآن کریم نے ہمارے لیے خاصا مواد فراہم کر دیا ہے۔ اولاد کے متعلق اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں خود اپنے لیے اور دیگر والدین کے لیے راہنمائی کی غرض سے اس مضمون میں ان انبیاء کرام علیہم السلام کی بطور والد سیرت کے مختلف پہلوؤں کو ترتیب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

E:\Ms-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq october05\ms13-08 misali walid.inp 8/22/2014 4:50 PM PAGE 1 (1,1)

نیک اولاد کی تمنا کرنا

سب سے پہلے انبیاء کرام کی سیرت میں حضرت زکریا اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کی شخصیت کا یہ پہلو ہمارے سامنے آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک بہترین نعمت اولاد ہے' لہٰذا اس کے لیے اللہ تعالیٰ سے خصوصی دعا کا اہتمام ہونا چاہیے۔ اس ضمن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے یہ الفاظ ہمیں قرآن کریم میں ملتے ہیں:

﴿رَبِّ هَبْ لِیْ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ﴾ (الصّٰفّٰت)

''اے میرے ربّ! مجھے نیک اولاد عطا فرما۔''

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نیک اولاد طلب کرنے کی حکمت کیا ہے؟ قاضی بیضاوی لکھتے ہیں کہ وہ دعوت واطاعت کے کاموں میں میری اعانت کریں اور پردیس میں میرے مونس اور غم خوار بنیں۔ کیونکہ اولاد کی نعمت کی تکمیل ان کی نیکی کے ساتھ ہوتی ہے۔ بیٹوں کی نیکی باپوں کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہوتی ہے۔ والدین کے ساتھ حسن سلوک بھی اولاد کی نیکی ہی کے آثار میں سے ہے۔ اولاد کے رحمت یا زحمت ہونے کا انحصار والدین کی تربیت پر ہے' کیونکہ بعض اوقات باپ بھی اپنے بیٹے کی سعادت یا شقاوت کا باعث بن جاتا ہے۔ اس مقام پر والدین کے لیے بھی تنبیہہ کا پہلو ہے کہ وہ اللہ سے محض اولاد نہ مانگیں بلکہ صالح اولاد کے لیے دعا کریں۔ کچھ لوگ اولاد کے بگڑنے کے بعد بھی اس مؤثر اور مفید دعا سے فائدہ نہیں اٹھاتے' جبکہ انبیاء کی سیرت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ اولاد ملنے سے پہلے ہی اس کے صالح ہونے کی دعا فرماتے تھے۔

دینی مصلحت کی دنیاوی مصلحت پر ترجیح

عام طور پر لوگ اپنی اولاد کے لیے وہاں گھر بناتے ہیں جہاں دنیاوی تعلیم کے لیے بہترین ادارے' ماحول اور سوسائٹی موجود ہو' جبکہ انبیاء کرام علیہم السلام کی سیرت سے ہمیں یہ روشنی ملتی ہے کہ وہ اپنی اولاد کے لیے ایسا مقام تلاش کرتے تھے جو دین کے لیے بہترین اثاثہ ثابت ہو۔ لہٰذا ان کو اُن مقامات پر جہاں خیر اور بھلائی کا دور دورہ ہو' بسایا جاتا اور ان مقامات سے محفوظ رکھا جاتا جہاں شر کا پہلو نمایاں ہو۔ آج لوگ مساجد کے قریب گھر لینے سے کتراتے ہیں اور ایسی جگہ تلاش کرتے ہیں کہ مسجد وہاں سے دور ہو' تاکہ ان کے آرام میں خلل نہ آئے' اگرچہ اس ضمن میں اہل مساجد کی کوتاہیاں اور سپیکر کا ناجائز استعمال بھی ایک اہم عامل ہے۔ تاہم کوشش کرنی چاہیے کہ ایسے اداروں کے قریب اپنی اولاد کو بسایا جائے جہاں خیر و

بھلائی کی روشنی ان تک پہنچ سکے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کو وہاں آباد کیا جہاں نہ پانی تھا نہ کھیتی' نہ سامانِ تعیش' لیکن وہ مقام دینی اعتبار سے مقدس تھا اور مقصود یہ تھا کہ وہ اللہ کے گھر کو آباد کرنے والے بن جائیں۔ نبی کریم ﷺ کی ایک حدیث مبارکہ ان لوگوں کے لیے جو محض دنیاوی مفادات کو پیشِ نظر رکھ کر اپنے اعمال کو ترتیب دیتے ہیں' تازیانۂ عبرت ہے۔ آپؐ کا ارشاد ہے:

((مَنْ كَانَتِ الدُّنْيَا هَمَّهُ جَعَلَ اللّٰهُ الْفَقْرَ بَيْنَ عَيْنَيْهِ ' وَفَرَّقَ عَلَيْهِ شَمْلَهُ ' وَلَمْ يَاْتِهِ مِنْهَا اِلَّا مَا قُدِّرَ لَـهُ))(جامع الترمذی'ابواب صفة القيامة)

''جس کا مقصود صرف دنیا ہو اللہ تعالیٰ اس کی پیشانی پر فقر مسلط کر دیتے ہیں' اس کے معاملہ کو بگاڑ دیتے ہیں اور دنیا اس کو اتنی ہی میسر آتی ہے جو اُس کے مقدر میں کی جا چکی ہو''۔

ہم اپنی دنیا سنوارنے کے لیے دین کو پسِ پشت ڈال دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ تو دین ہی کی برکات سے فائدہ اٹھا پاتے ہیں اور نہ ہی دنیا سدھرتی ہے۔

خوشحالی کی دعا

ایک باپ کے لیے اس سے بڑی خوشی کیا ہو سکتی ہے کہ اس کی اولاد خوشحال بھی ہو اور دین پر عمل پیرا بھی ہو۔ لہٰذا اسے اس ضمن میں بھی اپنی ذمہ داری سے غفلت نہیں برتنی چاہیے اور اولاد کی بہتری' رزق اور خوشحالی کے لیے دعا کرتے رہنا چاہیے۔ انبیاء کرام علیہم السلام کی سیرت سے ہمیں یہ روشنی بھی ملتی ہے کہ دین کے ساتھ ساتھ دنیاوی خوشحالی کے لیے بھی اولاد کے لیے دعا کرتے رہنا چاہیے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اماں ہاجرہ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو کھجوروں کا تھیلا اور پانی کا مشکیزہ مہیا کرنے پر اکتفا نہیں کیا تھا بلکہ اپنے ربّ سے التجا کی کہ وہ انہیں اور ان کی آئندہ نسل کو عمدہ رزق عطا فرمائے۔ ارشادِ ربّانی ہے:

﴿وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ﴾ (البقرة:١٢٦)

''اور جب ابراہیمؑ نے کہا: اے ربّ! اس جگہ کو امن والا شہر بنا دے' اور اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن پر ایمان لانے والے یہاں کے باشندوں کو پھلوں کا رزق عطا فرما!''

اس دعا سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی نسل کے لیے ان تمام اقسام کے پھلوں کے رزق کی دعا کی جو لوگوں کے درمیان معروف تھے۔ مزید یہ کہ ان کی نسل کے لیے خوشحالی کی

دعا کی کہ وہ سامانِ خورد و نوش کی قلت کے سبب وہاں سے کوچ کا ارادہ نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا کو قبول فرمایا اور جس چیز کے فقدان کا انہیں اندیشہ تھا وہی چیز اعلیٰ نوعیت اور وافر مقدار میں ان کی نسل اور اہل مکہ کو عطا فرمائی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جو آخرت کو ترجیح دیتا ہے اللہ تعالیٰ اس دنیا میں بھی اسے محروم نہیں رکھتے۔ پچھلے صفحہ پر ہم نے نبی اکرم ﷺ کی جو حدیث پڑھی اس کا اگلا حصہ اس حقیقت کو یوں واضح کرتا ہے:

((وَمَنْ كَانَتِ الْاٰخِرَةُ هَمَّهٗ جَعَلَ اللّٰهُ غِنَاهُ فِيْ قَلْبِهٖ وَجَمَعَ لَـهٗ شَمْلَهٗ وَاَتَتْهُ الدُّنْيَا وَهِيَ رَاغِمَةٌ)) (جامع الترمذی، ابواب صفة القيامة)

''اور جس کا مقصود آخرت ہو اللہ تعالیٰ اس کے دل میں تونگری ڈال دیتا ہے، اس کا معاملہ سدھار دیتا ہے اور دنیا ذلیل ہو کر اس کے پاس آتی ہے۔''

کس قسم کا رزق طلب کیا جائے!

اللہ تعالیٰ سے ایسا رزق طلب کرنا چاہیے جو انسان کے لیے عبادت و طاعت میں معاون ثابت ہو۔ کیونکہ ایسا رزق انسان کو اسلام کے دینی تقاضے پورے کرنے میں مدد دیتا ہے، جبکہ وہ رزق جو انسان کو اللہ کی نافرمانی اور معصیت کی جانب لے جائے تو ایسا رزق طلب کرنے کی ممانعت ہے۔ عقل مند شخص تو وہی ہے جو معاش کے لیے اس قدر جدوجہد کرے کہ توجہ اور دل جمعی سے اپنی دینی ذمہ داریاں پوری کر سکے۔ کیونکہ فکر معاش بہرحال ایک حقیقت ہے اور حدیث نبویؐ ''كَادَ الْفَقْرُ اَنْ يَّكُوْنَ كُفْرًا'' کے مصداق اس کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہے۔ دین اسلام کے ہر پیرو پر لازم ہے کہ وہ اپنے لیے اور اپنی اولاد کے لیے دُنیوی ساز و سامان اور مال و دولت طلب کرتے وقت اس کی غرض و غایت کو بھی سامنے رکھے۔ کیونکہ اگر یہ دولت محض ذاتی مفاد کے لیے جمع کرے گا تو نہ صرف یہ دینی تقاضوں کو پورا کرنے میں رکاوٹ بن جائے گی بلکہ اس کے لیے آخرت میں بھی خسارے کا باعث ہو گی۔ نبی کریم ﷺ کی ایک حدیث اس مفہوم کو یوں واضح کرتی ہے:

((تَعِسَ عَبْدُ الدِّيْنَارِ وَعَبْدُ الدِّرْهَمِ وَعَبْدُ الْخَمِيْصَةِ، اِنْ اُعْطِيَ رَضِيَ وَاِنْ لَّمْ يُعْطَ سَخِطَ، تَعِسَ وَانْتَكَسَ، وَاِذَا شِيْكَ فَلَا انْتَقَشَ)) (بخاریؒ کتاب الجهاد)

''دینار کا بندہ، درہم کا بندہ، چادر کا بندہ برباد ہو جائے، اگر اس کو کچھ دیا جائے تو خوش ہو جائے، اور اگر نہ دیا جائے تو روٹھ جائے، وہ گر کر چہرے کے بل بازی کھائے اور پھر سر کے بل الٹ جائے، اور جب اس کو کانٹا چبھ جائے تو کوئی اس کانٹے کو باہر کھینچنے

والا نہ ہو۔'' (شاید مقصود یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں میں اس کے لیے شفقت و ہمدردی کے جذبات نہ رہیں' اس کو مبتلائے مصیبت دیکھ کر کوئی اس پر ترس نہ کھائے۔)

حقیقتاً تو مال کا کوئی مقصد نہیں سوائے اس کے کہ اس کے ذریعے انسان اپنی آخرت کو سنوارے' انفاق فی سبیل اللہ کرے' حقوق العباد میں یتیموں' بیواؤں اور مساکین کا خیال رکھے۔ اللہ تعالیٰ نے فقر و فاقہ کے بعد اس کو جو تونگری عطا فرمائی ہے تو اس کے ساتھ نیک اعمال کر کے اپنے لیے زادِ آخرت بنالے۔

صالح ماحول کی دعا و کوشش کرنا

ہر شخص کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کی اولاد ایک پُر امن صالح ماحول اور معاشرے میں پرورش پائے۔ اس کے لیے محض خواہش ہی کافی نہیں ہے بلکہ اسلام نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ایک نظام دیا ہے جو اسی مقصد کے لیے ہے کہ انسان اپنی آئندہ نسلوں کے لیے ایک ایسا صالح معاشرہ مہیا کر سکے جس میں برائیوں کو پنپنے کا موقع نہ ملے اور اچھائیاں پھلیں پھولیں۔ لیکن یہ اسی صورت ممکن ہے کہ جب وہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو اپنائے اور اپنی اس معاشرتی ذمہ داری کو ادا کرے۔ اس کی اسی جدوجہد کے باعث یہ ممکن ہوگا کہ اس کی آئندہ نسلوں کو ایک پر امن' صالح معاشرہ مہیا ہو جائے جو اس کی نسلوں کو خیر و بھلائی' ایثار' پیار اور محبت کے ساتھ جینے کا موقع دے۔

تربیت اولاد میں ماحول کی اہمیت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ کوئی بھی مسلمان اپنی اولاد کو ایسے ماحول میں آباد کرنا نہیں چاہے گا جہاں شر و فساد کا دور دورہ ہو' فسق و فجور عام ہو اور شیطانی مراکز کی کثرت ہو' بلکہ انہیں وہاں بسائے گا جہاں خیر کا چلن ہو' نیکی غالب ہو' دینداری کا زور ہو' مساجد موجود ہوں' قرآن و سنت کی تعلیم کے مراکز ہوں' اسلامی اصولوں کی بنیاد پر نئی نسل کی تربیت کرنے والے ادارے موجود ہوں۔

آج کل کے دور میں' جبکہ اجتماعی قوانین و قواعد نے انسان کی انفرادی زندگی کا دائرۂ کار بہت محدود کر دیا ہے' ایک برے معاشرے میں کسی اچھے انسان کے لیے پاکیزہ زندگی گزارنا اتنا آسان نہیں ہے۔ اجتماعی ماحول اگر برا ہے تو انسان پر لازماً اثر انداز ہوتا ہے اور اس کی حالت یوں ہو جاتی ہے جیسے پانی سے باہر مچھلی کی ہو۔ برے ماحول کے منفی اور اچھے ماحول کے مثبت اثرات کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں بنی اسرائیل کے ایک شخص کا ذکر ہے جس نے ایک سو آدمیوں کو قتل کیا تھا۔ امام بخاری اور امام مسلمؒ دونوں نے

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بنی اسرائیل کے ایک شخص نے ننانوے آدمیوں کو قتل کیا تھا۔ پھر وہ (کسی بڑے عالم سے اپنی توبہ کے بارے میں) دریافت کرنے کی غرض سے نکلا۔ وہ ایک راہب کے پاس پہنچا اور اس سے پوچھا: ''کیا اس کے لیے توبہ ہے؟'' اس نے کہا نہیں۔ اس پر اُس نے اس راہب کو بھی قتل کر دیا۔ پھر اپنی توبہ کے بارے میں دریافت کرنا شروع کیا۔ ایک آدمی نے اس کو کہا ''فلاں فلاں بستی میں چلے جاؤ''۔ اور مسلم کی روایت میں ہے کہ اُس شخص نے کہا: ''ہاں تمہارے اور توبہ کے درمیان کون حائل ہوسکتا ہے؟ فلاں فلاں بستی کی طرف چلے جاؤ' وہاں اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والے ہیں' تم بھی ان کی صحبت میں اللہ کی عبادت کرنا اور اپنی بستی کی طرف نہ پلٹنا کہ وہ بری سرزمین ہے.....''۔ الحدیث۔

شرک و بدعت کی ضلالت سے بچانے کی سعی کرنا

جس طرح انسان دنیا میں چاہتا ہے کہ اس کی اولاد ہر قسم کے مسائل و مشکلات اور تنگ دستی سے بچی رہے اسی طرح اس کو چاہیے کہ اس کی اخلاقی تربیت کی جانب بھی توجہ رکھے۔ بہت سے والدین اس معاملے میں انتہائی لاپرواہی اور غفلت کے مرتکب ہوتے ہیں۔ گندی صحبت' میڈیا کی غلاظت اور مخلوط معاشرت سے اولاد کو روکتے نہیں' جب اس کے بداثرات سامنے آتے ہیں تو رونے بیٹھ جاتے ہیں۔ غور کرنا چاہیے کہ انبیاء اس ضمن میں اپنی اولاد کے لیے کس قدر فکرمند تھے۔ یہ فکرمندی ہمیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سیرت میں بدرجۂ اتم نظر آتی ہے کہ خود بھی حنیف ہیں اور چاہتے ہیں کہ اولاد بھی شرک و بدعت کی ضلالت سے محفوظ رہے۔ اور یہ فکر صرف اپنی ذات تک محدود نہیں ہے بلکہ اللہ تبارک و تعالیٰ کے سامنے عاجزی سے اپنی اولاد کی عافیت کے لیے دعا مانگتے ہیں۔

اصل معاملہ یہ ہے کہ مادی قوانین فوری عمل کرتے ہیں جبکہ اخلاقی قوانین دیر سے اثر انداز ہوتے ہیں' لہٰذا والدین اسی خوش فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں کہ ان کی اولاد رذائل اخلاق سے محفوظ رہے گی' مگر ایسا نہیں ہوتا۔ مادی قوانین کی مثال یوں ہے کہ اگر آپ گرم چائے میں انگلی ڈالیں تو آپ کی انگلی جل جائے گی اور آپ کو فوراً اندازہ ہو جائے گا کہ گرم چائے کا اثر فوری ہوتا ہے۔ زہر کے بارے میں ہر شخص جانتا ہے کہ وہ انسان کے لیے موت کا باعث ہے' لہٰذا کوئی شخص بھی زہر کھانے کے لیے تیار نہیں ہوتا' کیونکہ یہ بات یقینی ہے کہ اس کا نتیجہ فوری سامنے آئے گا۔ دوسری جانب ہم دیکھتے ہیں کہ انسان نے جھوٹ بولا مگر اس کی زبان

پر کوئی چھالا تک نہیں نکلا۔ لہٰذا انسان کا اخلاقی قوانین کے اثر انداز ہونے کی صلاحیت پر اعتماد کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ لیکن صاحب نظر لوگ مادی قوانین کی طرح اخلاقی قوانین پر بھی پوری طرح یقین رکھتے ہیں کہ وہ اثر انداز ہو کر رہیں گے۔ اسی لیے ہمیں سیرتِ ابراہیمیؑ میں نظر آتا ہے کہ آپؑ اپنی اولاد کے لیے کس قدر فکر مند ہیں اور کس قدر عاجزی اور لجاجت سے اللہ تعالیٰ کے حضور فریاد کر رہے ہیں:

﴿رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ (ابراھیم)

''اے میرے ربّ! یقیناً انہوں نے بہت لوگوں کو گمراہ کیا ہے' پس جس نے میری پیروی کی وہ میرا ہے' اور جس نے میری نافرمانی کی پس تو یقیناً معاف کرنے والا مہربان ہے۔''

شیخ ابراہیم تیمیؒ نے کیا خوب بات کہی ہے کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے بعد کون مبتلائے فتنہ ہونے کے ڈر سے آزاد رہ سکتا ہے؟ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے التجا کی کہ مجھے اور میری اولاد کو اس بات سے بچائے رکھنا کہ ہم اس طرح بُتوں کی عبادت کریں جس طرح کہ میرے باپ اور میری قوم نے کی۔

اولاد کے لیے عملی نمونہ بننا

والدین اپنی اولاد کے لیے اوّلین نمونہ ہوتے ہیں' لہٰذا والدین کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایسا عمل نہ کریں جو اس تعلیم کے خلاف ہو جو وہ اولاد کو دے رہے ہیں۔ ہم میں سے کتنے والدین ہیں جو اپنے بچوں کو نیکی کی راہ پر گامزن کرنا چاہتے ہیں لیکن خود اس راہ سے دور رہتے ہیں۔ اپنی اولاد کو غلط کاموں سے روکتے ہیں لیکن خود وہی کام کرتے ہیں۔ سب بچوں کو تعلیم دی جاتی ہے کہ جھوٹ بولنا بری بات ہے' مگر ایسا بھی ہوتا ہے کہ باپ کا کوئی دوست ملنے آ جائے تو بچے سے کہا جاتا ہے کہ جا کر کہہ دو کہ والد صاحب گھر پر نہیں ہیں۔ جو لوگ سگریٹ نوشی کرتے ہیں وہ کس طرح یہ توقع رکھتے ہیں کہ اولاد ان کو سگریٹ نوشی کرتے دیکھ کر اس بری عادت میں مبتلا نہیں ہوگی۔ مزید یہ کہ بچے کے ننھے منے ہاتھوں سے سگریٹ کیس یا ماچس منگوائی جاتی ہے۔ جب یہی بچہ سگریٹ نوشی کرتا ہے تو والدین اس کے لیے اخلاقی نصیحتیں شروع کر دیتے ہیں' حالانکہ اس جرم میں وہ بھی برابر کے شریک ہیں۔ کیا یہ نادان لوگ اس حقیقت سے آگاہ نہیں کہ ''ایک ٹن وعظ سے ایک اونس عمل زیادہ تأثیر کا حامل ہوتا

E:\Ms-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq october05\ms13-08 misali walid.inp 8/22/2014 4:50 PM PAGE 4 (1,1)

ہے''۔اور عمل کی آواز نصیحت کی آواز سے زیادہ وزنی ہوتی ہے۔ جب بچے والدین میں یہ تضاد پاتے ہیں تو ان کے اچھے اعمال بھی ان کی نگاہوں میں وقعت کھو دیتے ہیں۔ والدین کے قول و فعل میں تضاد نہیں' یکسانیت ہونی چاہیے۔اسی طرح اگر والد خود نماز کی پابندی نہیں کرتا' وعدہ نہیں نبھاتا' جھوٹ بولتا ہے' بدزبانی کرتا اور گھٹیا کردار کا حامل ہے تو وہ اپنی اولاد کو اِن رذائل سے کیسے بچا سکتا ہے! گویا خاندان کے سربراہ کو ایک اچھے مسلمان کی سی زندگی گزارنا ہوگی تاکہ اُس کے گھر والے خود بخود اُس کے نقش قدم پر چل کر پسندیدہ کردار اپنا سکیں۔حضرت ابراہیمؑ کی یہ خوبی قرآن کریم میں یوں بیان کی گئی ہے:

﴿اِذۡ قَالَ لَـهٗ رَبُّهٗۤ اَسۡلِمۡ قَالَ اَسۡلَمۡتُ لِرَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ۝١٣١ وَوَصّٰى بِهَاۤ اِبۡرٰهٖمُ بَنِيۡهِ وَيَعۡقُوۡبُ ؕ يٰبَنِىَّ اِنَّ اللّٰهَ اصۡطَفٰى لَـكُمُ الدِّيۡنَ فَلَا تَمُوۡتُنَّ اِلَّا وَاَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ ۝١٣٢﴾ (البقرۃ)

''جب اُس کے ربّ نے اس کو کہا: فرماں بردار ہو جا تو اس نے کہا: میں نے ربّ العالمین کی فرمانبرداری قبول کی۔اور اسی بات کی وصیت ابراہیم اور یعقوب (علیہما السلام) نے اپنے بیٹوں کو کی کہ اے بیٹو! یقیناً اللہ تعالیٰ نے اس دین کو تمہارے لیے پسند کر لیا ہے' سو تم ہرگز نہ مرنا مگر مسلمان!''

اولاد کی مسلسل خبر گیری کرنا

باپ کی ذمہ داری ہے کہ وہ دینی اور دنیاوی مصروفیات میں اس قدر مشغول نہ ہو جائے کہ اس کی اولاد نظر انداز ہو جائے۔ معاشی سرگرمیوں اور عبادات میں اعتدال قائم رکھے تاکہ اولاد کے حقوق پورے ہوتے رہیں۔اس پر لازم ہے کہ اپنی جنت کی خواہش میں دوسروں کے حقوق تلف نہ کرے۔ایسا نہ ہو کہ حقوق العباد کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے وہ جنت تو کیا پائے یہ عمل اس کو جہنم میں دھکیل دے۔بعض والدین اپنی اولاد کے ضمن میں افراط و تفریط کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کچھ حضرات مال و زر کی طلب میں اس قدر مگن ہو جاتے ہیں کہ اولاد کے معاملات میں توجہ اور دلچسپی کے لیے ان کے پاس وقت ہی نہیں ہوتا۔بعض اپنے نالائق ساتھیوں کے ہمراہ لذتوں میں اس قدر ڈوب جاتے ہیں کہ اولاد کے احوال کا جائزہ لینا اور ان کے بارے میں غور و فکر کرنا ان کی کتابِ زندگی سے خارج نظر آتا ہے۔علاوہ ازیں کچھ لوگوں کو ایک دم نیکی کا ہیضہ ہو جاتا ہے کہ وہ بیوی بچوں کی ذمہ داریوں سے فرار حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور دین کی آڑ میں اولاد کی خبر گیری کے دینی تقاضوں

کو پامال کرتے ہوئے مہینوں گھر سے دُور رہتے ہیں۔ جب ان کی غفلت' بے توجہی اور لاپرواہی کے سبب اولاد پٹڑی سے اُتر جاتی ہے تو پھر کفِ افسوس ملنے کے سوا ان کے لیے کوئی چارۂ کار نہیں رہتا۔ ان بدنصیب والدین کی مثال اس کسان کی مانند ہے جو کھیت میں فصل بو کر اس کو جڑی بوٹیوں اور کیڑے مکوڑوں سے نہ بچائے اور جب فصل تباہ ہو جائے تو عالمِ پریشانی میں سرگرداں یہ کہے کہ اللہ کو ایسا ہی منظور تھا۔

حضرت ابراہیم اپنے بیٹے اسماعیل اور بیوی ہاجرہ علیہما السلام کی مسلسل خبر گیری کے لیے مکہ تشریف لاتے رہے۔ اس ضمن میں کئی واقعات تاریخ کے صفحات میں موجود ہیں۔ صحیح بخاری' کتاب الانبیاء میں حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ حضرت اسماعیلؑ کی شادی کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے چھوڑے ہوئے کنبے کی خبر گیری کی خاطر تشریف لائے مگر اسماعیلؑ کو گھر پر نہ پایا۔ ان کی بیوی سے ان کے متعلق دریافت کیا' اس نے جواب دیا کہ وہ ہمارے لیے رزق کی تلاش میں نکلے ہیں۔ پھر انہوں نے ان کی معیشت اور حالات کے متعلق بھی استفسار کیا۔

نیک اعمال میں اولاد کو شریک کرنا

خیر کے کاموں میں باپ کے ساتھ بیٹے کی شمولیت کی اہمیت کسی شخص سے مخفی نہیں ہے کہ اس کے ذریعے نہ صرف والد کو اپنی اولاد کی تربیت کرنے کا موقع ملتا ہے بلکہ آئندہ کے لیے اولاد کو دین پر استقامت بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ مگر ہمارے معاشرے میں اس ضمن میں اس قدر افراط و تفریط کا معاملہ ہے کہ ہم میں سے دعوتِ دین میں سرگرم بعض حضرات کا معاملہ یوں ہوتا ہے کہ باپ تو حزب اللہ میں شامل ہے اور بیٹا حزب الشیطان میں۔ اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ والد مکرم نے اپنے لختِ جگر کو نیکی کے کاموں میں اپنا شریک سفر بنانے کی کوشش ہی نہیں کی ہوتی۔ حالانکہ اولاد کو نیکی کی ترغیب دینا اور اس کے لیے کوشش کرنا فرض ہے' جبکہ دوسروں کو اسی ضمن میں ترغیب اور کوشش فرضِ کفایہ کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اپنوں میں ستائش کا معاملہ نہیں ہوتا جبکہ دوسروں کی جانب توجہ رکھنے سے انسان کی تعریف کی جاتی ہے جس سے اس کے نفس کی تسکین کا سامان بھی مہیا ہوتا ہے۔ سیرتِ ابراہیمیؑ سے ایک مثال ملاحظہ ہو:

﴿وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۲۷﴾﴾ (البقرۃ)

''یاد کرو جب اٹھا رہے تھے ابراہیم (علیہ السلام) بنیادیں خانہ کعبہ کی اور اسماعیل (علیہ السلام) بھی۔ اے ہمارے پروردگار! قبول فرما ہم سے (یہ عمل) بے شک تو ہی سب کچھ سننے والا سب کچھ جاننے والا ہے۔''

اولاد سے مشاورت

عموماً والدین اس پہلو پر کوئی خاص توجہ نہیں دیتے۔ مسئلہ اولاد کی تعلیم کا ہو یا رشتے وغیرہ کا' اولاد کے ذہن کو جانے بغیر اپنا فیصلہ ٹھونسنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ بچے کا رجحان تعلیم میں جس مضمون کی طرف ہوتا ہے اگر اس کی کوئی مادی افادیت والدین کو سمجھ نہ آ رہی ہو تو وہ کوشش کرتے ہیں کہ اولاد کے لیے ایسے مضامین کا انتخاب کریں جن کے ذریعے مادی فوائد کا حصول آسان ہو جائے' مگر زبردستی ٹھونسا جانے والا یہ مضمون اولاد کے لیے مشکلات پیدا کرتا ہے اور آگے بڑھنے کی بجائے اس کے تعلیمی مستقبل کو ہی مخدوش بنا دیتا ہے۔ اسی طرح کا معاملہ ہم رشتوں کے ضمن میں بھی دیکھتے ہیں کہ والدین اپنے مفادات کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔ اولاد کی رضامندی جانے بغیر صرف اپنی پسند پر فیصلہ کر دیتے ہیں' جس کا نتیجہ معاشرتی تباہی کی صورت میں نکلتا ہے۔ انبیاء کرام علیہم السلام کی سیرت میں ہمیں مشاورت کا یہ پہلو اتنا نمایاں نظر آتا ہے کہ بوقت ذبح بھی حضرت ابراہیم اپنے بیٹے اسماعیل (علیہما السلام) سے مشورہ کرتے نظر آتے ہیں۔

مشورہ کی حکمت یہ ہوتی ہے کہ آپ کو اپنی اولاد کے ردِّعمل کے بارے میں معلوم ہو جائے کہ اس مسئلے میں جو اُس کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے یا اس پر ٹھونسا جا رہا ہے وہ اس کو کس نظر سے دیکھ رہی ہے۔ اس کی آمادگی یا ناپسندیدگی کے بعد ہی عقل مند والدین کوئی لائحہ عمل اختیار کرتے ہیں' جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اولاد برضا و رغبت اس عمل میں شریک ہو جاتی ہے۔ انجام کار بھی یہ عمل فائدہ مند اور والدین اور اولاد دونوں کے لیے مضبوط تعلقات کا باعث بنتا ہے۔ اگر اولاد والدین کے ساتھ پیش آمدہ مسئلہ میں متفق نہیں ہے تو والدین کو چاہیے کہ دلائل کے ساتھ اولاد کو قائل کریں اور ان کے ذہن میں جو بھی اشکالات ہیں ان کو دور کریں۔

اس کے برعکس جو والدین صرف حکم دینا جانتے ہیں اور اولاد کی رضامندی یا ناراضی کو اہمیت نہیں دیتے وہ ناقابل تلافی نقصان اٹھاتے ہیں۔ یہ طرزِ عمل اصلاح کا محتاج ہے۔ اگر اولاد کا ذہن مذہب کی طرف مائل ہو تو کوشش کرنی چاہیے کہ اس کی اس دلچسپی کو دیکھتے ہوئے معتدل رویہ اپنایا جائے۔ دعوت و تربیت کے بنیادی اصولوں میں سے ایک یہ ہے کہ مخاطب

کے حالات کو پیشِ نظر رکھا جائے اور حدودِ شریعت کی پابندی کرتے ہوئے اس کے ردّعمل کا خیال رکھا جائے۔ تفصیل کے خواہش مند سورۃ الصافات ملاحظہ فرمائیں۔

بعض والدین ایسے بھی ہوتے ہیں جو اولاد کو شرعی امور کا حکم دینے سے پہلے ان سے مشورہ کرتے ہیں' لیکن ان کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ اگر اولاد راضی ہو تو شریعت کی پابندی کا حکم دیا جائے وگرنہ اس کو چھوڑ دیا جائے۔ یہ طرزِ عمل قطعی غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مقابلے میں کسی کی کوئی حیثیت نہیں۔ اولاد تو کیا' حکم الٰہی کے مقابلے میں والدین کی بات پر بھی عمل نہ کیا جائے گا' کیونکہ اس ضمن میں حضور اکرم ﷺ نے ایک اصول دے دیا ہے کہ ((لاَ طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِیْ مَعْصِیَةِ الْخَالِقِ)) یعنی جہاں پر خالق کی نافرمانی ہوتی ہو وہاں مخلوق کی اطاعت نہیں کی جائے گی!

اولاد آزمائش ہے

اولاد سے محبت کا جذبہ انسان کی فطرت میں ڈالا گیا ہے۔ قرآن کریم نے اس موضوع کو کئی مقامات پر بیان کیا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿اِنَّمَا اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ اَجْرٌ عَظِيْمٌ﴾ (التغابن)

''بے شک تمہارے مال اور تمہاری اولاد بڑی آزمائش ہیں۔ اور اللہ ہی ہے جس کے پاس اجرِ عظیم ہے۔''

افسوس کا مقام ہے کہ ہم میں سے بہت سے والدین یہ دعویٰ تو کرتے ہیں کہ وہ اللہ کی محبت پر کسی کی محبت کو ترجیح نہیں دیتے' مگر عملاً یوں ہوتا ہے کہ اولاد کی ایسی خواہشات کے سامنے ہتھیار ڈال دیتے ہیں جو سراسر شریعت کے منافی ہوتی ہیں۔ جہاں اللہ کی محبت اور اولاد کی محبت کا ٹکراؤ ہوا فوراً پلڑا اولاد کی طرف جھکا دیا اور ان کی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے اللہ کے احکامات کو توڑنے پر تل گئے۔ ہم اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ ہمارا اور ہماری اولاد کا خالق و مالک' رازق اور ربّ اللہ ہی ہے' اور ہماری اور اولاد کی دینی اور دنیاوی دونوں کامیابیاں اس کے احکامات کی تعمیل میں ہی مضمر ہیں۔ خاص طور پر دینی اور دنیاوی علوم میں معتدل رویہ اپنانا چاہیے' کیونکہ اگر اولاد دنیا میں ترقی کر بھی لے لیکن دینی پہلو کمزور رہ جائے تو یہ اولاد کے لیے باعث خسارہ ہے۔ ہم میں سے اکثر والدین یہی سوچتے رہتے ہیں کہ ہمارے مرنے کے بعد بچوں کا کیا بنے گا' اور پھر جو کچھ بن پڑتا ہے وہ اولاد کے لیے کرتے ہیں' لیکن دُور اندیش' صاحب بصیرت' عقلمند لوگ یہ بھی سوچتے ہیں کہ بچوں کے

مرنے کے بعد ان کا کیا بنے گا؟ کیونکہ اصل حقیقت تو یہی ہے کہ اگر ہمارے بچے دنیا میں خواہ کچھ ہی کیوں نہ بن جائیں مگر آخرت میں ناکام ہو جائیں تو حقیقتاً وہ ناکام ہو گئے کہ اصل خسارہ تو اُخروی خسارہ ہے۔ انبیاء اپنی اولاد کے لیے دونوں پہلوؤں پر سوچا کرتے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعاؤں میں سے ایک دعا یہ بھی تھی کہ اللہ تعالیٰ ان کی نسل میں سے ایک ایسا رسول مبعوث فرما دے جو اُن پر اُس کی آیات کی تلاوت کرے' اس کی قدرت' علم اور حکمت کے دلائل ان کے سامنے بیان کرے' رموزِ شریعت اور شرعی احکام کے اغراض و مقاصد سے انہیں آگاہ کرے اور ان کا تزکیہ کرے۔ یہاں جس حکمت کا ذکر ہے یہی وہ ''الحکمہ'' ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ''جس کو حکمت دی گئی اس کو بڑی خوبی اور بھلائی دی گئی' اور نصیحت صرف عقل مند لوگ ہی حاصل کرتے ہیں''۔

دین پر ثابت قدمی کی تاکید کرتے رہنا

انبیاء کرام علیہم السلام کی سیرت سے ہمیں یہ روشنی بھی ملتی ہے کہ وہ اولاد کو مسلسل دین پر ثابت قدم رہنے اور مہلک اعمال سے بچنے کی تلقین کرتے رہے۔ کہیں پر ہمیں یہ معاملہ اختصار کے ساتھ نظر آتا ہے اور کہیں پورے شرح وبسط کے ساتھ اس موضوع کو بیان کیا گیا ہے۔ قرآن میں سورۃ لقمان کا دوسرا رکوع اس سلسلہ میں خاص اہمیت کا حامل ہے۔ تاہم اس مثال میں اپنے بیٹے کو وصیت کرنے والے حضرت لقمان انبیاء میں شامل نہیں ہیں۔ حضرت لقمان اپنے بیٹے سے کہتے ہیں:

﴿يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ۖ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ﴾

''اے میرے بچے! اللہ کے ساتھ شرک نہ کرنا' یقیناً شرک بہت بڑا ظلم اور بہت بڑی ناانصافی ہے۔''

دین پر استقامت صاحبِ عزیمت لوگوں کا کام ہے۔ اسی لیے انبیاء کرام علیہم السلام اپنی اولادوں کو بار بار استقامت کی تلقین کرتے رہے۔ ذہن میں رہنا چاہیے کہ اسلام کی کچھ تعلیمات انفرادی ہیں اور کچھ اجتماعی۔ انفرادی معاملات میں آزمائش کا مرحلہ ذرا کم شدت کا حامل ہوتا ہے' لیکن جب آپ گھریلو زندگی کو سنوارنے کی کوشش کرتے ہیں تو اگر بیوی بچے آپ کے نقطۂ نظر کے حامی ہیں تو شکر کا مقام ہے' ورنہ یہ کام صبر آزما اور پیہم جدوجہد کا حامل ہے کہ آپ ان کے ذہن تبدیل کر سکیں۔ دین حق پر ثابت قدم رہنے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر جمے رہنے کی وصیت کتنی اہم ہے! اللہ تعالیٰ نے سورۂ آل عمران کی آیت ۱۰۲ میں اہل

ایمان کو اسی کا حکم دیا ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾﴾

''اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کا اِس قدر تقویٰ اختیار کرو جتنا اُس کے تقویٰ کا حق ہے' اور ہرگز نہ مرنا مگر مسلمان (یعنی مرتے دم تک مسلمان ہی رہنا)۔''

ہمیں بھی چاہیے کہ اپنی اولادوں کو دین پر ثابت قدمی اور اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری پر جمے رہنے کا حکم دیتے رہیں۔ ہماری اولادوں کی بظاہر دین داری اس بات کی تلقین اور تاکید کی راہ میں رکاوٹ نہ بننے پائے۔

وعظ و نصیحت ـــــ ایک مسلسل عمل

والد کو مستقل مزاج اور بردبار ہونا چاہیے کہ اولاد کی تربیت ایک مسلسل عمل ہے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ نے ایک مرتبہ یا دو تین مرتبہ اولاد کی کسی غلطی پر سرزنش کی اور جب دیکھا کہ وہ باز نہیں آتی تو دل چھوڑ بیٹھے۔ اس کا نتیجہ والد کے حق میں اچھا نہیں ہوتا۔ یہ کام ایک دو روز یا چند سالوں کا نہیں' بلکہ مسلسل اور پیہم جدوجہد اور ذمہ داری ہے جو مستقل مزاجی کا تقاضا کرتی ہے۔ اس میں صبر و تحمل کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹنا چاہیے۔ آپ کا یہ عمل بچے کی پیدائش سے شروع ہو جاتا ہے اور اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک کہ اللہ آپ کو اس سے یا اس کو آپ سے جدا نہ کر دے۔ انبیاء کرام علیہم السلام کی سیرت میں بھی ہمیں یہ چیز ملتی ہے کہ وہ تادمِ واپسیں اپنی اولاد کو وعظ و نصیحت کرتے رہے۔ اسی بات کے شواہد میں نبی کریم ﷺ کا مرض الموت میں شدتِ درد کے باوجود اُمت کو آپؐ کی قبر کو مسجد بنانے سے سختی سے منع فرمانا' موت کی ہچکی بندھنے کے وقت نماز قائم کرنے کا حکم دینا اور غلاموں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید فرمانا' اور قوتِ گویائی کے ختم ہونے کے بعد بھی ان دونوں باتوں کی تلقین جاری رکھنے کی کوشش فرمانا شامل ہیں۔ اور اسی بات کے شواہد میں امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا بسترِ مرگ پر لوگوں کو مثنیٰ بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں عراقی محاذ پر جہاد کے لیے نکلنے کی ترغیب دینا' اور شدید زخمی ہونے کے بعد بسترِ مرگ ہی پر ایک نوجوان کو تکیوں سے چادر اوپر اٹھانے کا حکم دینا شامل ہیں۔

بڑی عمر کی اولاد کو نصیحت ایک مشکل امر ہوتا ہے۔ مقامِ افسوس ہے کہ بہت سے والدین سمجھتے ہیں کہ اولاد کے سنِ بلوغت کو پہنچنے کے بعد انہیں کہنے سننے کی ذمہ داری ختم

ہوئی۔ معلوم نہیں انہوں نے یہ بات کہاں سے سیکھی ہے۔ اور کتنے ہی ناسمجھ والدین خیال کرتے ہیں کہ اولاد کی شادی کے بعد تو انہیں وعظ و نصیحت کرنا عقل و دانشمندی اور حکمت کے منافی ہے۔ کیا ان کی عقل و دانش انبیاء کرام علیہم السلام سے زیادہ ہے؟ ہمیں نبی اکرم ﷺ کی سیرت سے یہ روشنی ملتی ہے کہ آپؐ اپنی جگر گوشہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو اُن کے شوہر محترم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گھر جا کر وعظ و نصیحت فرماتے رہے۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنی لختِ جگر اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو نبی کریم ﷺ کے گھر جا کر تنبیہہ کی۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اپنی بیٹی اُمّ المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی کاشانۂ نبویؐ پر جا کر بازپُرس کی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سیرت سے پتہ چلتا ہے کہ آپؑ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی شادی کے بعد بہوؤں کو بھی نصیحت فرماتے رہے۔

والدین کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی اولاد کی کردار سازی میں کسی طرح کی غفلت اور عدم توجہی اختیار نہ کریں، بلکہ پوری کوشش اور جدوجہد کے ساتھ دوسروں کے حقوق کی ادائیگی کا اہتمام کریں، جس کے لیے پہلا قدم یہ ہے کہ خود اچھے مسلمان بنیں، قرآن سیکھیں، سیرت کا مطالعہ کریں، بزرگانِ دین اور صالح لوگوں کے مضبوط کردار سے واقفیت حاصل کریں اور اس کی روشنی میں پسندیدہ شخصیت بنیں۔ نتیجتاً نیکیاں اختیار کریں اور برائیوں سے پرہیز کریں، تاکہ خود دوزخ کی آگ سے محفوظ رہیں۔ دوسرے قدم کے طور پر اپنے بیوی بچوں کے حقوق سے آگاہی حاصل کر کے انہیں اچھے اخلاق اور مضبوط کردار سے آراستہ کریں۔ اولاد کی تربیت اسلامی خطوط پر استوار کرنے کے لیے اور ماں باپ کی حقیقی فضیلت کا اہل بننے کے لیے اچھا ماں باپ بننا ضروری ہے۔ اس ضمن میں ہمہ وقت اپنے اخلاق و کردار پر تنقیدی نگاہ ڈالنا ناگزیر ہے۔

اولاد میں باہمی حسد و عداوت کی صورت میں والدین کا رویہ

یہ بات فطری ہے کہ باپ اپنی اولاد میں صالح اور نیک اولاد کو پسند کرتا ہے اور اس کا طبعی رجحان اور محبت کا وافر حصہ اس نیک اولاد کو ملتا ہے۔ اس میں کوئی برائی نہیں اگر اس رویہ کو معتدل رکھا جائے اور باقی اولاد کے حقوق بھی پورے ادا کیے جائیں۔ جہاں تک دل کا معاملہ ہے تو اس میں انسان کا کوئی زور نہیں۔ سیرتِ انبیاء کرامؑ میں حضرت یعقوب علیہ السلام کی مثال اس ضمن میں ہمارے لیے رہنمائی فراہم کرتی ہے۔ آپؑ حضرت یوسف علیہ السلام کا ان کے باقی بھائیوں کے مقابلے میں خاص خیال رکھتے تھے۔ چونکہ حضرت یوسفؑ بچپن ہی سے نیک

اور صالح فطرت کے حامل تھے لہٰذا ان کی شخصیت کے یہ روشن پہلو حضرت یعقوبؑ کی توجہ اپنی طرف کھینچتے تھے۔ قرآن کریم نے اس واقعہ کو عبرت و نصیحت کے لیے قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ حضرت یوسفؑ کو اللہ تعالیٰ نے نہ صرف نبوت سے نوازا تھا بلکہ آپؑ خوابوں کی تعبیر بھی بتایا کرتے تھے۔ سورۂ یوسف میں ان کا واقعہ ایک خواب سے شروع ہوتا ہے جو وہ اپنے والد سے بیان کرتے ہیں کہ:

''یہ اُس وقت کا ذکر ہے جب یوسفؑ نے اپنے باپ سے کہا ''ابا جان' میں نے خواب دیکھا ہے کہ گیارہ ستارے ہیں اور سورج اور چاند ہیں اور وہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں''۔ جواب میں اس کے باپ نے کہا: بیٹا اپنا یہ خواب اپنے بھائیوں کو نہ سنانا ورنہ وہ تیرے درپے آزار ہو جائیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ شیطان آدمی کا کھلا دشمن ہے۔ اور ایسا ہی ہوگا (جیسا تو نے خواب میں دیکھا ہے) کہ تیرا ربّ تجھے (اپنے کام کے لیے) منتخب کرے گا اور تجھے باتوں کی تہہ تک پہنچنا سکھائے گا اور تیرے اوپر اور آلِ یعقوب پر اپنی نعمت اسی طرح پوری کرے گا جس طرح اس سے پہلے وہ تیرے بزرگوں ابراہیمؑ اور اسحاقؑ پر کر چکا ہے' یقیناً تیرا ربّ علیم اور حکیم ہے۔'' (آیات ۴ تا ۶)

حضرت یوسف علیہ السلام کے دس بھائی دوسری ماؤں سے تھے جبکہ سب سے چھوٹا بنیامین ان کا سگا بھائی تھا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کو معلوم تھا کہ سوتیلے بھائی یوسفؑ سے حسد رکھتے ہیں اور اخلاق کے لحاظ سے بھی ایسے صالح نہیں کہ اپنا مطلب نکالنے کے لیے کوئی ناروا کارروائی کرنے میں انہیں کوئی تأمل ہو' اس لیے انہوں نے اپنے صالح بیٹے کو متنبہ فرما دیا کہ ان سے ہوشیار رہنا۔

حسد و رقابت کے جذبات اولاد میں پیدا ہو جاتے ہیں' کیونکہ صلاحیتوں کے اعتبار سے انسان مختلف ہیں۔ ضروری نہیں کہ چار بھائی ہوں اور تمام ایک ہی جیسی صلاحیتوں کے مالک ہوں' بلکہ ہوسکتا ہے کہ ایک کا رجحان کسی ایک شعبہ میں ہو جبکہ دوسرے کا اس شعبہ میں کوئی رجحان نہ ہو۔ اسی طرح ذہنی صلاحیتوں میں فرق ہوسکتا ہے' جسمانی صلاحیتوں میں کمی بیشی ہوسکتی ہے' غرض اس اختلاف کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں۔ اس صورت میں والد کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اپنی ذمہ داری کو احسن طریقہ سے نبھائے اور اولاد کے درمیان اعتدال پسندی کا رویہ اپناتے ہوئے اُن کی راہنمائی کرتا رہے۔

نافرمان اولاد سے طرزِ عمل شریعت کے مطابق ہو

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ باپ تو نیک اور صالح ہے جبکہ اولاد اس کے برعکس فاسق و فاجر ہے۔ اس صورت میں باپ بیٹے کا رشتہ تو برقرار رہتا ہے لیکن دونوں کا نظریاتی بُعد اُن کا قلبی تعلق مضبوط نہیں ہونے دیتا۔ اب یہ والدین کے لیے ''نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن'' والی کیفیت ہے کہ نہ تو اولاد کو چھوڑ سکتے ہیں نہ ہی کوشش کے باوجود اس کو صالح بنا سکتے ہیں۔ اس ضمن میں حضرت نوح علیہ السلام کے کردار سے ہمیں رہنمائی ملتی ہے۔ جب قومِ نوحؑ کی نافرمانیوں کے سبب باری تعالیٰ کی جانب سے عذاب کا فیصلہ ہوا تو ایک جانب نوحؑ ہیں اور دوسری جانب ان کا نافرمان بیٹا ہے۔ اس کے متعلق حضرت نوحؑ کے جذبات کا اظہار اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا جواب قرآن حکیم میں بایں الفاظ وارد ہوا ہے:

> ''اور نوحؑ نے اپنے ربّ کو پکارا: اے ربّ! میرا بیٹا میرے گھر والوں میں سے ہے اور تیرا وعدہ سچا ہے اور تو سب حاکموں سے بڑا اور بہتر حاکم ہے۔ جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اے نوحؑ! وہ تیرے گھر والوں میں سے نہیں ہے، وہ تو ایک بگڑا ہوا کام ہے، لہٰذا تو اس بات کی مجھ سے درخواست نہ کر کہ جس کی حقیقت تو نہیں جانتا، میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ اپنے آپ کو جاہلوں کی طرح نہ بنا لے۔ نوحؑ نے فوراً عرض کیا: اے میرے ربّ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ وہ چیز تجھ سے مانگوں جس کا مجھے علم نہیں۔ اور اگر تو نے مجھے معاف نہ کیا اور مجھ پر رحم نہ فرمایا تو میں برباد ہو جاؤں گا۔'' (ہود: ۴۵۔۴۷)

اس سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ والد اپنی اولاد کی اصلاح کے لیے ہر ممکن کوشش کرے، باقی ہدایت کا معاملہ خالصتاً اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، اور یہ کہ انسان ظاہر پر فیصلہ کر سکتا ہے، دل کا معاملہ اس کے بس میں نہیں، وہ تو بنانے والا خالق ہی جان سکتا ہے۔ بہرحال والدین کو چاہیے کہ ہر ممکن کوشش کریں کہ اولاد کو صالح بنا سکیں، اور اگر وہ نہ بن سکی تو اُن کی محنت رائیگاں نہیں جائے گی اور اللہ کے ہاں ان کے اس عذر کو قبول کر لیا جائے گا۔

صاحب علم اولاد کی تحسین کرنا

انسانی زندگی کے بہت سے پہلو ہیں جن میں بعض اوقات صاحب علم اولاد والدین کو بہتر مشورہ دے سکتی ہے۔ اس طرح کے مسائل ہمیں روزمرہ زندگی میں پیش آتے رہتے ہیں کہ والدین باوجود اپنے علم اور تجربہ کے صحیح فیصلہ تک پہنچنے کے لیے تذبذب کا شکار ہو جاتے

ہیں۔ اس صورت میں ہوسکتا ہے کہ جو نکتہ والد کی نظر سے پوشیدہ ہو وہ صاحبِ فہم اولاد کی نظر میں آ جائے اور یوں مسئلہ سلجھانے میں سہولت ہو جائے۔ انبیاء میں سے حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام اللہ کے دو جلیل القدر پیغمبر ہیں جن کو اللہ نے اپنی نعمتیں اور اقتدار و حکومت عطا کیا تھا۔ قرآن کریم میں ہمیں کئی مقامات پر اُن کا تذکرہ ملتا ہے جن میں ہمارے لیے رہنمائی موجود ہے۔ سورۃ الانبیاء (آیت ۷۸، ۷۹) میں ایک مقدمے کا ذکر ہے جس میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی صائب رائے نے حضرت داؤد علیہ السلام کو مقدمہ نمٹانے میں مدد دی۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَدَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ ۚ وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ ۝ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا ۚ﴾

''اور اسی نعمت سے ہم نے داؤد و سلیمان (علیہما السلام) کو سرفراز کیا۔ یاد کرو وہ موقع جبکہ وہ دونوں ایک کھیت کے مقدمے میں فیصلہ کر رہے تھے جس میں رات کے وقت دوسرے لوگوں کی بکریاں پھیل گئی تھیں، اور ہم اُن کی عدالت خود دیکھ رہے تھے۔ اُس وقت ہم نے صحیح فیصلہ سلیمانؑ کو سجھا دیا، حالانکہ حکم اور علم ہم نے دونوں ہی کو عطا کیا تھا''۔

حضرت سلیمان علیہ السلام بچپن ہی سے اس قدر غیر معمولی سمجھ کی باتیں کرتے تھے کہ سننے والے حیران رہ جاتے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی خدمت میں ایک مقدمہ پیش ہوا کہ ایک شخص کے کھیت میں رات کے وقت دوسرے لوگوں کی بکریاں آ گھسیں، جس سے کھیتی کا نقصان ہوا۔ حضرت داؤدؑ نے یہ دیکھ کر کہ بکریوں کی قیمت اس مالیت کے برابر ہے جس کا کھیت والے نے نقصان اٹھایا تھا، یہ فیصلہ کیا کہ بکریاں کھیتی والے کو دے دی جائیں۔ مگر حضرت سلیمانؑ نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ میرے نزدیک کھیتی والا بکریاں اپنے پاس رکھے اور دودھ پیے اور بکریوں والے کھیت کی آبپاشی اور دیکھ بھال میں محنت کریں، جب کھیتی جیسی تھی ویسی ہو جائے تو کھیتی والا بکریاں لوٹا دے اور کھیتی واپس لے لے۔ اس میں دونوں کا نقصان نہ ہوگا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے بھی یہ فیصلہ سن کر تحسین فرمائی اور اپنے اجتہاد سے رجوع کیا۔ باپ بیٹے دونوں نے جو فیصلہ شرکائے مقدمہ کے حق میں کیا وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے تھا اور دونوں ہی کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے فیصلہ کرنے کی قوت اور سمجھ عنایت کی

تھی، لیکن اصل گُر کی بات اُس نے سلیمان علیہ السلام کو سجھا دی اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے جو اللہ کے نزدیک اصلح واصوب تھا اور جسے آخر کار داؤد علیہ السلام نے بھی قبول کیا۔

اب آج کل کے والدین کا رویہ ملاحظہ ہو؟ اولاد کے صاحب علم ہونے کے باوجود نہ تو والدین ان کی رائے کو اہمیت دیتے ہیں اور نہ یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ آیا وہ حق پر ہیں یا نہیں۔ آیئے چند مثالوں سے والدین کا رویہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آج کل ماڈرن ازم کا دور ہے، خاص طور پر پروپیگنڈا کے ذریعے عورت کو ہمارے معاشرے میں جس طرح نمایاں کیا جا رہا ہے اور جس منفی اور جذباتی انداز میں اس کی تشہیر کی جا رہی ہے وہ کسی بھی غیرت مند اور خود دار شخص کے لیے، جس کو ربّ نے بیٹیوں یا بہنوں سے نوازا ہے، قابل برداشت نہیں۔ میڈیا کی یلغار کے سامنے عورت جس طرح ہتھیار ڈالتی جا رہی ہے اس میں اگر بھائی یا والدین پر کار بند ہونا چاہتے ہیں جبکہ بیٹیاں ماڈرن ازم کی رو میں بہہ رہی ہیں تو اب والد کے لیے بڑا مسئلہ کھڑا ہو جاتا ہے کہ اس معاملے کو کیسے نمٹائے۔ اگر سمجھانے کی کوشش کرتا ہے تو بیوی سامنے کھڑی ہو جاتی ہے اور بیٹیاں جو ماڈرن بننا چاہتی ہیں، پردہ اور رشتوں کی پابندیاں ان کو قبول نہیں ہیں۔ بھائی یا والد کی خواہش ہے کہ گھر کے ماحول کو اسلامی رکھا جائے جبکہ ماں اور بیٹیاں اس کی راہ میں شدید مزاحمت کر رہی ہیں۔ گویا گھر ایک میدانِ جنگ بن چکا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے اپنی بیٹیوں کی دینی تعلیم میں جو غفلت برتی ہے اور ان کو ٹی وی، وی سی آر اور کیبل جیسی لعنت میں گرفتار ہونے کے لیے آزاد چھوڑ دیا ہے یہ اسی کا ثمر ہے۔ والدین جس طرح دنیاوی تعلیم کے لیے ہزاروں کی فیسیں بھرتے ہیں اگر دینی تعلیم کے لیے بھی سینکڑوں روپے خرچ کر لیں تو اگرچہ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا نتیجہ اولاد کی جانب سے لازماً بھلائی کی صورت میں نکلے گا، البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ آج کل کے دور میں خیر و بھلائی کا کچھ نہ کچھ عنصر اولاد میں ضرور باقی رہے گا۔

دوسری مثال شادی بیاہ کے موقع پر سامنے آتی ہے کہ عورتوں میں نمائش کا جذبہ چونکہ زیادہ ہوتا ہے لہٰذا ایک دوسرے کو مات دینے کے لیے ایک سے بڑھ کر ایک جوڑے بنائے جاتے ہیں اور اس میں اخلاق و اقدار کی دھجیاں بھی بکھیر دی جاتی ہیں۔ ایسے موقع پر بھائیوں کی مزاحمت گھریلو زندگی میں تلخیاں بکھیر دیتی ہے۔ اگر والدین ایسے موقع پر مثبت رویہ نہ اپنائیں تو ہو سکتا ہے کہ اولاد کے مابین انتشار اور نفرت پیدا ہو جائے اور بجائے محبت و اخوت کے نفرت و علیحدگی کے جراثیم ان میں جگہ بنانے لگیں۔

تیسری مثال مخلوط تعلیم کی ہے کہ معاشرے میں فیشن ڈیزائننگ' بوتیک' مخلوط یونیورسٹیوں اور کالجز کا رواج ہے۔ اکثر بیٹیاں پردہ اور حیا کا لباس پسند نہیں کرتیں۔ والد یا بھائی اپنے مذہبی مزاج کے باعث اس چیز کو گوارا نہیں کرتے مگر والدہ بیٹی کی حمایت میں اخلاق واقدار کا کوئی اصول ماننے پر تیار نہیں ہوتی۔ والد کو چاہیے کہ ایسے موقع پر عمدہ دلائل کے ساتھ بیوی کو سمجھانے کی کوشش کرے اور اس کے حسن و قبح کو مثالوں کے ذریعے اپنی استطاعت کے مطابق سمجھائے اور اللہ کا خوف دلائے۔

اولاد کو عاق کرنے کی شرعی حیثیت

ایک اور مسئلہ جو آج کے دور کی پیداوار ہے' یہ ہے کہ والدین جائز یا ناجائز بات نہ ماننے کی صورت میں اولاد کو عاق کر دیتے ہیں اور باقاعدہ اخبارات میں اس کے لیے اشتہارات جاری کر دیے جاتے ہیں۔ عاق کرنے کا تصور اسلامی شریعت میں موجود نہیں ہے۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ آپ اولاد کے اعمال سے خود کو بریٔ الذمہ رکھنے کے لیے معاشرے کو آگاہ کر دیں۔ جہاں تک تعلق ہے وراثت سے محروم کرنے کا تو اس کی صرف یہ صورت ہے کہ اولاد مرتد ہو جائے یا ماں باپ کو قتل کر دے' دوسری کوئی صورت شریعت اسلامیہ نے نہیں رکھی جس کے تحت اولاد کو وراثت سے محروم کیا جاسکتا ہو۔ اولاد چاہے نافرمان ہو' والدین کو یہ حق نہیں دیا گیا کہ وہ اس کو جائیداد سے بے دخل کر کے معاشرے کے رحم وکرم پر جرائم کی دلدل میں دھکیل دیں۔ انبیاء کرام علیہم السلام کی سیرت سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ اولاد کی نافرمانی کے باوجود اس تعلق کو آخر دم تک نبھایا جائے گا جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام کی مثال سے ظاہر ہے۔ البتہ اگر باپ ربّ کا نافرمان ہو اور اولاد فرمانبردار و نیک ہو تو اس صورت میں باپ کو چھوڑا جاسکتا ہے' کیونکہ والد بہرحال گھر کا منتظم اور سربراہ ہوتا ہے اور اس کی مخالفت کی صورت میں اولاد کے لیے اس گھر میں اپنے اعمال کو دیانت داری سے انجام دینا ممکن نہیں ہے۔ اس کی مثال حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سیرت میں ہمیں بایں طور ملتی ہے:

﴿قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِیْ یٰۤاِبْرٰهِیْمُ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِیْ مَلِیًّا ﴿۴۶﴾ قَالَ سَلٰمٌ عَلَیْكَ ۚ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّیْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِیْ حَفِیًّا ﴿۴۷﴾ وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَاَدْعُوْا رَبِّیْ ۫ عَسٰۤی اَلَّاۤ اَكُوْنَ بِدُعَآءِ رَبِّیْ شَقِیًّا ﴿۴۸﴾﴾ (مریم)

''باپ نے کہا: اے ابراہیم! کیا تو میرے معبودوں سے پھر گیا ہے؟ اگر تو باز نہ آیا تو میں تجھے سنگسار کر دوں گا۔ بس تو ہمیشہ کے لیے مجھ سے الگ ہو جا۔ ابراہیم نے کہا: سلام ہو آپ پر۔ عنقریب میں اپنے ربّ سے آپ کی بخشش کی دعا کروں گا۔ میرا ربّ مجھ پر بڑا ہی مہربان ہے۔ میں آپ لوگوں کو بھی چھوڑتا ہوں اور ان ہستیوں کو بھی جنہیں آپ لوگ خدا کو چھوڑ کر پکارا کرتے ہو۔ میں تو اپنے ربّ ہی کو پکاروں گا۔ امید ہے کہ میں اپنے ربّ کو پکار کر نامراد نہ رہوں گا۔''

لے پالک کی حیثیت

جہاں ہمارے معاشرتی رویوں میں زوال پیدا ہوا ہے وہاں ہم نے ان رشتوں کا احترام تو چھوڑ دیا ہے جن کو قرآن وسنت میں قابل احترام قرار دیا گیا ہے' جبکہ کچھ اور نئے رشتے گھڑ لیے ہیں' جن میں منہ بولا بیٹا' منہ بولی بہن' لے پالک بیٹا وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اخبارات میں اکثر ایسے واقعات ہمارے سامنے آتے ہیں کہ لوگ مُنہ بولے رشتے بنا کر نہ صرف جان و مال بلکہ عزت وآبرو سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ ان مصنوعی رشتوں کی اسلام میں کوئی اہمیت نہیں۔ یہ محض ہماری ذہنی اختراعات ہیں۔ اگر ان رشتوں کو اہمیت دے دی جائے تو اسلام کے سارے نظام معاشرت کی دھجیاں بکھر جائیں گی۔ نہ کسی کی بیٹی محفوظ رہے گی' نہ ماں' نہ بیوی۔ پھر تو جو جس کو چاہے اپنی مُنہ بولی بیٹی' بہن یا ماں بنا لے اور اسلام کے احکاماتِ ستر وحجاب کو اپنی نفس پرستی کی بھینٹ چڑھا دے۔ حقیقتاً اس ضمن میں قرآن کریم نے نہایت واضح اسلوب اپنایا ہے کہ:

﴿مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ ۚ وَمَا جَعَلَ اَزْوَاجَكُمُ الّٰٓـِٔيْ تُظٰهِرُوْنَ مِنْهُنَّ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيْلَ﴾ (الاحزاب)

''نہیں بنائے اللہ تعالیٰ نے ایک آدمی کے لیے دو دل اس کے شکم میں۔ اور نہیں بنایا اس نے تمہاری بیویوں کو جن سے تم ظہار کرتے ہو تمہاری مائیں' اور نہیں بنایا اس نے تمہارے مُنہ بولے بیٹوں کو تمہارے فرزند۔ یہ صرف تمہارے مُنہ کی باتیں ہیں' اور اللہ تعالیٰ تو سچی بات کہتا ہے اور وہ ہدایت دیتا ہے سیدھی راہ پر چلنے کی۔''

آیت کریمہ واضح کرتی ہے کہ جس طرح ایک آدمی کے سینہ میں دو دل نہیں ہو سکتے اسی طرح ایک شخص کی حقیقتاً دو مائیں یا ایک بیٹے کے دو باپ نہیں ہو سکتے۔ جاہلیت کے زمانے

میں کوئی اپنی بیوی کو ماں کہہ دیتا تو وہ ساری عمر کے لیے اس سے جدا ہو جاتی۔ گویا اس لفظ سے وہ حقیقی ماں بن گئی۔ اور کسی کو منہ بولا بیٹا بنالیا جاتا تو اسے سچ مچ بیٹا سمجھا جاتا تھا اور اس پر بیٹے کے سب احکام جاری ہوتے تھے۔ قرآن کریم نے اس لفظی و مصنوعی تعلق کو حقیقی اور قدرتی تعلق سے جدا کرنے کے لیے ان رسوم و مفروضات کی بڑی شدّ و مدّ سے تردید فرمائی اور واضح فرما دیا کہ ان مصنوعی رشتوں پر حقیقی ماں باپ اور اولاد کے احکام جاری نہیں کیے جا سکتے۔ لے پالک اور مُنہ بولے بیٹے یا بیٹیاں نہ تو اصل اولاد کے برابر حقوق رکھتے ہیں اور نہ ہی وارث ہو سکتے ہیں اور نہ ہی ان کے لیے پردہ کے احکامات کو توڑا جا سکتا ہے۔ انصاف کی بات تو یہ ہے کہ ہر شخص کی نسبت اس کے حقیقی باپ کی طرف کی جائے' کسی کو کسی نے ''لے پالک'' بنالیا تو وہ واقعی اس کا باپ نہیں بن گیا۔ شفقت و محبت سے کوئی کسی کو مجازاً بیٹا یا باپ کہہ کر پکار لے وہ دوسری بات ہے۔ غرض یہ ہے کہ نسبی تعلقات اور ان کے احکام میں اشتباہ والتباس واقع نہ ہونے پائے۔ ابتدائے اسلام میں نبی کریم ﷺ نے زید بن حارثہ کو آزاد کر کے متبنیٰ بنالیا تھا۔ چنانچہ دستور کے موافق لوگ انہیں زید بن محمد (ﷺ) کہہ کر پکارنے لگے۔ مگر سورۃ الاحزاب کی مذکورہ بالا آیت کے نزول کے بعد سب لوگ انہیں زید بن حارثہ پکارنے لگے۔

سیرتِ انبیاء اور قرآنی تعلیمات سے یہ چند واقعات اولاد کی تربیت کے ضمن میں مرتب کیے گئے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ قرآن محض ثواب کے لیے پڑھنے کی چیز نہیں ہے' بلکہ اس کا اصل مقصد ''ہدایت'' ہے۔ غور و فکر اور تدبر سے آنکھیں بند کر کے اس کو محض رٹے رٹائے انداز میں پڑھتے چلے جانا نہ تو خود انسان میں کوئی تبدیلی لا سکتا ہے اور نہ ہی اس سے معاشرے میں کوئی خیر و بھلائی پھیل سکتی ہے۔ والدین جس قدر اپنے گھر کا ماحول اسلامی تعلیمات کے مطابق بنائیں گے اسی قدر ان کی اولاد پر اس کا اثر ہوگا۔ والدین اولاد کے لیے اوّلین نمونہ ہیں۔ اولاد میں پائی جانے والی ہر خرابی کی لکیر والدین کی تربیت کی طرف جاتی ہے' کیونکہ اولاد کی مثال تو ایک پودے کی طرح ہے کہ اگر مالی اس کی اچھی طرح سے دیکھ بھال کرے اور زمین کو جڑی بوٹیوں سے پاک رکھے تو وہ بہتر طریقے سے نشو و نما پائے گا' لیکن اگر مالی اس پودے سے بے پروا ہو جائے' نہ تو پانی میں ترتیب کا خیال رکھے' نہ خاردار جھاڑیوں کی فکر کرے تو پودا نہ تو اچھے انداز میں نشو و نما پائے گا اور نہ ہی اس سے خلقِ خدا فائدہ اٹھا سکے گی۔ oo

جدید دنیائے اسلام

قسط وار سلسلہ (24)

پاکستان (۳)

تحقیق وتحریر: سید قاسم محمود

مغلیہ عہد میں پنجاب کا احوال ہم پچھلے شمارے میں دیکھ آئے ہیں۔ انگریزوں کے تسلط سے پہلے پاکستان کے ایک اور اہم صوبے سندھ کے مسلمانوں کے حالات پر بھی ایک سرسری نظر ڈال لینا ضروری ہے۔

فیروز شاہ تغلق کے انتقال (1389ء) کے بعد سندھ بہت جلد سلطنت دہلی سے آزاد ہو گیا اور وہاں سمّہ قبیلے نے ایک خودمختار سلطنت قائم کر لی جو 1520ء (یعنی بابر بادشاہ کے آنے سے چھ سال پہلے) تک قائم رہی۔ اس قبیلے کے فرماں روا ''جام'' کہلاتے تھے اور اُن کی تعداد پندرہ سے انیس تک بیان کی جاتی ہے۔ ان میں جان سنجر اور جام نظام الدین نندا زیادہ مشہور ہیں۔ نندا کا زمانہ بڑی خوشحالی کا تھا۔ جام نندا کا مقبرہ مکلی پہاڑی (ٹھٹھہ) کی عمارتوں میں نمایاں نظر آتا ہے۔ ان دنوں ملتان میں لنگاہ خاندان کی حکومت تھی۔ 1540ء میں شاہ بیگ ارغون نے سندھ پر حملہ کیا اور دو تین سال کے اندر پورے سندھ پر قابض ہو گیا۔ ہمایوں جب شیر شاہ سوری سے شکست کھا کر سندھ آیا تو مرزا شاہ حسن ارغون حکمران تھا' اور اس نے شکست خوردہ بادشاہ کی طرف کوئی التفات نہ کیا۔ مغلوں کے ارغون قبیلے کے علاوہ سندھ میں اُس وقت ایک اور بڑا اہم قبیلہ ترخان تھا۔ سولہویں صدی عیسوی کے وسط کے کچھ بعد سندھ کی عنانِ حکومت ترخانوں کے ہاتھ میں آ گئی۔ انہی کے دور میں پرتگالیوں نے ٹھٹھہ کو تاراج کیا (1555ء)۔ اکبر نے جب سندھ کو پوری طرح زیر تسلط لانے کی ٹھانی تو وہاں کا حاکم مرزا جانی بیگ ترخان تھا۔

1592ء میں سندھ مغلیہ سلطنت کا حصہ بن گیا۔ سترہویں صدی کے اوائل میں داؤد پوتہ خاندان نے شمالی سندھ پر زور پکڑا۔ اٹھارویں صدی میں کلہوڑا خاندان کے امیروں نے سر اٹھایا اور اورنگ زیب نے ان کی نیم خودمختار حیثیت تسلیم کر لی۔ 1737ء میں کلہوڑا پورے سندھ پر حاوی ہو

چکے تھے' لیکن اس کے بعد مغربی سرحدوں سے حملے شروع ہو گئے اور نادر شاہ' احمد شاہ ابدالی' تیمور شاہ اور ان کے فوجی سرداروں کے حملوں نے سندھ کو تباہ کر دیا۔ 1783ء میں تالپور خاندان برسر اقتدار آیا' لیکن یہ دور خانہ جنگیوں کا شکار رہا۔ 1809ء میں انگریزوں نے امیرانِ سندھ سے دوستی کا معاہدہ کیا' لیکن چند ہی سال بعد انہوں نے اس کی خلاف ورزی شروع کر دی اور بالآخر 1843ء میں سندھ پر قبضہ کر لیا۔

اسلامی عہد پر ایک نظر

برعظیم پاک و ہند میں مسلمانوں کی پہلی حکومت سندھ میں قائم ہوئی تھی' لیکن ایک مستقل اسلامی سلطنت کی بنیاد قطب الدین ایبک نے ڈالی اور اس کا دارالحکومت دہلی قرار پایا۔ حکومت کی نوعیت شخصی بادشاہت کی تھی' جس میں اکثر عسکریت کا رنگ غالب رہا۔ مسلمانوں نے نہ صرف ملک میں لامرکزیت کا خاتمہ کیا' بلکہ نظم و نسق حکومت اور بندوبستِ اراضی کا ایک باقاعدہ اور مستقل نظام بھی قائم کیا۔ اس دور میں کئی ایسے بادشاہ ہوئے ہیں' جنہوں نے بڑے تدبر اور جاں فشانی سے سلطنت کو استحکام' عوام کو خوشحالی اور ملک کو امن و امان بخشا۔ مقامی ہندوؤں کے ساتھ انتہائی شفقت اور رواداری کا سلوک روا رکھا اور انہیں ہر طرح کے تحفظات دیے۔

برعظیم پاک و ہند کے مسلمان بادشاہوں نے علوم و فنون کی جیسی سرپرستی کی' اُس کی مثال تاریخ میں مشکل ہی سے ملے گی۔ اُن کی قدردانی کا اس قدر شہرہ تھا کہ تمام اسلامی ممالک کے اہل کمال یہاں کھنچے چلے آتے تھے۔ علم و فن کی سرپرستی ایک ایسی روایت تھی' جسے عہد زوال کے فرماں روا بھی نباہتے رہے۔ چنانچہ بہادر شاہ ظفر تک لال قلعے کا اُلٹا پُلٹا دربار علم و شعر کا گہوارہ اور علماء و شعراء کا مرکز بنا رہا۔ عہدِ اسلامی میں ابتدا ہی سے تعلیم کو خصوصی توجہ کا مستحق سمجھا گیا۔ بڑے بڑے شہروں کے علاوہ قصبات و دیہات میں بھی مدرسے قائم کیے گئے۔ علماء و معلمین کو فکر معاش سے آزاد کیا' طلبہ کے لیے وظائف جاری کیے اور ملک کے کونے کونے میں علم کی روشنی پھیلائی۔ سرکاری مدرسوں کے علاوہ اربابِ خیر اور علمائے دین نے بھی لاتعداد مدرسے قائم کر رکھے تھے۔ یہاں کے بعض ادارے اپنی تعلیم و تدریس کے لیے اسلامی ممالک میں مشہور تھے (مثلاً لاہور میں ملاّ جمال' ملاّ یوسف اور ملاّ عبدالسلام کے مدارس' سیالکوٹ میں ملاّ کمال اور ان کے نامور فرزند عبدالحکیم کا مدرسہ اور لکھنؤ میں فرنگی محل کا مدرسۂ نظامیہ)' اور تحصیل علم کے لیے یہاں کثیر تعداد میں غیر ملکی طالب علم آتے تھے۔ اس دور میں فنون لطیفہ' بالخصوص مصوری' خطاطی اور فن تعمیر کی بے حد حوصلہ افزائی ہوئی۔ عہد اسلامی کی لاتعداد یادگاریں آج بھی مسلمان فن کاروں کے کمال کا ثبوت پیش کر رہی ہیں۔ اکثر سلاطین کی یہ کوشش رہی کہ وہ یہاں ایک فلاحی مملکت قائم کریں۔ زراعت اور کاشتکاروں کی بہبود پر اُن کی خاص نظر تھی۔

زراعت کو ترقی دینے کے لیے ایک خاص محکمہ (دیوانِ کوھی) قائم تھا' جس کے سپرد بنجر زمینوں کو قابل کاشت بنانے اور کم پانی والے علاقے میں کنویں اور نہریں اور بند تعمیر کرانے کا کام تھا۔ قحط کے زمانے میں کاشت کاروں کو خاص طور پر مدد دی جاتی تھی۔ اِن فرماں رواؤں نے عوام کے اخلاق و معاشرت کی نگرانی کے لیے محکمۂ احتساب قائم کیا' جس نے شراب خوری' قمار بازی اور چور بازاری کا سدّ باب کرنے کی بڑی کوشش کی۔ لاتعداد سڑکیں' پل' تالاب' کنوئیں' سرائیں' مسجدیں' شفاخانے اور مدرسے بنوائے گئے۔ درویشوں' بیواؤں' یتیموں اور محتاجوں کی اعانت وسیع پیمانے پر حکومت کی طرف سے بھی ہوئی تھی اور صاحبِ استطاعت افراد بھی کرتے تھے۔ تاریخ میں سلاطین اور اُن کے امراء کی فیاضی اور غریب پروری کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔ محکمۂ خیرات وحسنات کی طرف سے علماء وطلبہ میں سرکاری وظائف تقسیم ہوتے اور لوگوں کو مدد معاش کے لیے عطیات دیئے جاتے تھے۔ مجموعی طور پر ملک دولت مند اور خوشحال تھا۔ لوگوں کی یہ آسودگی زراعت وتجارت اور صنعت وحرفت کی ترقی کی مرہونِ منت تھی اور اس میں فرماں رواؤں کے حسنِ انتظام اور رعایا پروری کا بڑا حصہ تھا۔

اسلامی سلطنت کا زوال

اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں سلطنت مغلیہ کی حدود برعظیم کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل چکی تھیں' لیکن اورنگ زیب کی وفات کے بعد اس کا شیرازہ بکھرنے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ اس زوال کا ایک بنیادی سبب مسلمانوں کا علمی انحطاط تھا۔ تاتاریوں کے حملوں سے اسلامی ممالک کو جو سب سے بڑا نقصان پہنچا' وہ یہ تھا کہ کتب خانے ضائع ہو گئے' درس گاہیں اجڑ گئیں' علماء کا کوئی پُرسان حال نہ رہا' تعلیم کا معیار حد درجہ پست اور تحقیق وتجسّس کا مادہ مفقود ہو گیا اور جدید علوم و فنون سیکھنے کا ذوق جاتا رہا۔ اس فکری اور ذہنی زوال کا اثر ان کی عسکری قوت پر بھی پڑا۔ بابر کے بعد طریقِ جنگ میں کوئی ترقی نہ ہو سکی۔ یورپ میں فنونِ حرب میں انقلابی تبدیلیاں لائی جا رہی تھیں' لیکن برعظیم کے مسلمان حکمران پرانی لکیر کو پیٹتے چلے جا رہے تھے۔ اس سلسلے میں اُن کی بے خبری اور بے نیازی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو گا کہ ایک طرف تو بحریہ (نیوی) قائم کرنے کی کبھی ضرورت ہی نہ سمجھی گئی اور دوسری طرف توپ خانے کا استعمال معدودے چند لوگوں تک محدود رکھا گیا۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے اکثر فرنگیوں کو ملازم رکھنا پڑا۔

اسلامی سلطنت کے زوال کا ایک اور بڑا سبب وہ اخلاقی کمزوریاں تھیں جو اجتماعی اور انفرادی طور پر پوری قوم میں در آئی تھیں۔ امن وامان کے طویل ادوار' سلطنت کے استحکام اور معاشی خوشحالی نے رفتہ رفتہ بادشاہ اور امراء ہی کو نہیں' عوام کو بھی سہل انگار اور عیش کوش بنا دیا۔ اس چیز نے بدنظمی کو راہ دی۔ عمالِ حکومت کے لیے فرائضِ منصبی سے گریز معمول بن گیا اور اپنے معیارِ زندگی کو بلند تر کرنے

کے لیے وہ ہر طرح کی بدعنوانیوں کے مرتکب ہونے لگے' یہاں تک کہ ملک وملت سے غداری بھی ان کے نزدیک کوئی جرم یا گناہ نہ رہا۔

شخصی بادشاہت میں ملک میں امن واستحکام فی الحقیقت بادشاہ کے ذاتی کردار' حسنِ تدبیر اور شجاعت پر منحصر ہوتا ہے اور کمزور اور نااہل شخص کے برسرِ حکومت آتے ہی ملک اور اہل ملک انتشار کا شکار ہو جاتے ہیں۔ برعظیم میں تخت نشینی کا کوئی مسلمہ اصول نہ ہونے کے باعث بادشاہ کی وفات پر شہزادوں اور امراء میں اکثر ٹھن جاتی تھی۔ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات (1707ء) کے بعد یہ صورت حال بدسے بدتر ہوتی گئی اور باہمی ناچاقیوں اور خانہ جنگیوں نے نظم ونسق کی بربادی کے علاوہ مرکزی حکومت کی عسکری قوت اس حد تک تباہ کر دی کہ شورش پسندوں کی معمولی ہنگامہ آرائیوں کو فرو کرنا بھی اس کے بس میں نہ رہا اور مغلوں کی عظیم الشان سلطنت پارہ پارہ ہوگئی۔

انگریزوں کی آمد

برعظیم پاک وہند میں یورپی اقوام (پرتگال' ولندیزی' فرانسیسی' انگریز وغیرہ) پندرہویں صدی عیسوی کے اواخر میں بہ سلسلۂ تجارت آئیں۔ رفتہ رفتہ اُن کی تجارتی کوٹھیاں جنوبی ہند کے مغربی اور مشرقی ساحلوں پر اور خلیج بنگال کی بندرگاہوں میں قائم ہوگئیں اور انہوں نے تجارت کے ساتھ ساتھ اپنی سیاست کا جال بھی پھیلانا شروع کیا۔ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد مغلیہ سلطنت پر تیزی سے زوال آیا اور صوبوں میں طوائف الملوکی اور افراتفری پھیلی تو مغربی اقوام میں ملک گیری کا حوصلہ پیدا ہوا اور وہ مختلف مقامی قوتوں کے ہنگامۂ مسابقت میں مدعیانِ حکومت کی معاون بن کر میدان میں اتر آئیں۔ پرتگالی تو اپنے تشدد اور بے تدبیری کے باعث جلد ہی یہاں سے نکل گئے۔ ولندیزی بھی کوئی نمایاں حیثیت حاصل نہ کر سکے۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں کے مابین ایک عرصے تک آویزش جاری رہی' جس میں انگریز غالب آئے۔ شمال میں نجیب الدولہ اور حافظ رحمت خان' جنوب میں حیدر علی اور ٹیپو سلطان' اور مشرق میں علی وردی اور سراج الدولہ وغیرہ نے مغربی استعمار کے بڑھتے ہوئے طوفان کو روکنے کی کوشش کی' لیکن انگریزوں کو بہتر اسلحہ' بہتر فوجی نظم' اعلیٰ درجے کی بحری طاقت' ایک منظم اور مضبوط سلطنت کی سرپرستی اور متعدد بے ضمیر مقامی ریاستوں کی تائید وحمایت کی بدولت غیر معمولی برتری حاصل تھی۔ چنانچہ انیسویں صدی کے وسط تک پورا ہندوستان انگریزوں کے قبضے میں آ گیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی

1600ء میں انگلستان کی ملکہ الزبتھ کی اجازت سے ''ایسٹ انڈیا کمپنی'' کے نام سے ایک

تجارتی کمپنی وجود میں آئی' جسے برعظیم سے تجارت کا اجارہ دے دیا گیا۔ اُسی زمانے میں فرانسیسیوں نے بھی اپنی ایسٹ انڈیا کمپنی بنا کر ہندوستان سے تجارت شروع کر دی۔ چونکہ مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد ملک میں لاتعداد چھوٹی چھوٹی خودمختار ریاستیں قائم ہو چکی تھیں اور ان میں ہمیشہ جنگ جاری رہتی تھی' اس لیے بیرونی تاجروں کو ان کے باہمی جھگڑوں میں دخل دے کر اپنی طاقت بڑھانے کا آسانی سے موقع مل گیا۔ اٹھارہویں صدی کا نصفِ آخر جنوبی ہند میں ان کی باہمی آویزشوں اور ریشہ دوانیوں کا زمانہ ہے' اس میں انگریز کامیاب رہے اور فرانسیسی اُن کے لیے میدان خالی کر گئے۔

بنگال میں انگریزوں کی آمد

اب بنگال (مشرقی پاکستان' حال بنگلہ دیش) کی باری آئی۔ یہ صوبہ اورنگ زیب کی وفات کے کچھ عرصہ بعد خودمختار ہو گیا تھا۔ اس کے مدبر اور قابل حکمران علی وردی خان نے جیتے جی انگریزوں کو اُن کی حدود سے باہر قدم نہ رکھنے دیا۔ اس کے بعد اس کا نواسہ سراج الدولہ مسندنشین ہوا۔ وہ ایک محبِّ وطن فرماں روا تھا۔ انگریزوں نے اس کے مخالفین اور باغیوں کو پناہ دے کر اور کلکتہ میں قلعہ بندی کر کے ملکی قوانین کی خلاف ورزی کی۔ جب نواب سراج الدولہ نے کلکتہ پر چڑھائی کر کے انگریزوں کو ذلت آمیز شکست دی تو وہ اس کی حکومت کا تختہ الٹنے کی تیاریاں کرنے لگے۔ فوجی ساز و سامان اکٹھا کرنے اور دکن سے فوج منگوانے کے علاوہ انہوں نے نواب کے وزیر میر جعفر اور بعض دوسرے عمّال کو لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا۔ جون 1757ء میں پلاسی کے مقام پر جنگ ہوئی۔ میر جعفر کی غداری کے باعث نواب کی فوج کو شکست ہوئی۔ میر جعفر کو گدی پر بٹھا دیا گیا اور یوں بالواسطہ طور پر بنگال انگریزوں کے قبضے میں آ گیا۔

میر جعفر کی معزولی کے بعد نواب میر قاسم نے انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو روکنے کی آخری کوشش کی' لیکن ''جنگ بکسر'' میں میر قاسم' شجاع الدولہ اور شاہ عالم کی متحدہ فوج کو شکست دے کر ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی عسکری فوقیت کا سکّہ جما دیا۔ نوابوں اور انگریزوں کی اس کشمکش میں بقول مؤرخ کے' کے 'دت ہندو امراء اور عمائدین نے انگریزوں کا ساتھ دیا۔ نوابی برائے نام اب بھی قائم رکھی گئی' لیکن اصل اقتدار کمپنی بہادر کے ہاتھ میں تھا۔ جنگ بکسر کے ایک سال بعد مغل بادشاہ شاہ عالم ثانی نے بنگال اور بہار کی دیوانی (مال گزاری) بھی باضابطہ طور پر انگریزوں کے حوالے کر دی۔ انہوں نے اپنی تجارت کو بڑھانے میں من مانی کارروائیاں کیں اور دونوں ہاتھوں سے بنگال کی دولت سمیٹی۔ لوگوں کو تشدد کا نشانہ بنایا۔ انگلستان سے درآمدہ مال کی کھپت کے لیے یہاں کی صنعتیں پوری طرح تباہ کر دیں اور اہلِ حرفہ کو قلّاش بنا دیا۔

دکن میں انگریز

دکن میں تین اہم طاقتیں تھیں: حیدرآباد، مرہٹے اور میسور۔ حیدرآباد پوری طرح انگریزوں کا وفادار تھا۔ مرہٹے اپنی باہمی ناچاقی کے باوجود خود مختار اسلامی ریاستوں کو یکسر ختم کر کے پورے ہندوستان پر اپنا راج قائم کرنے کے خواہاں تھے۔ میسور میں حیدر علی نے ایک مستحکم ریاست قائم کر کے حیدرآباد اور مرہٹوں کے علاوہ انگریزوں کو بھی میدانِ جنگ میں مات دی۔ اس کے بعد ٹیپو سلطان نے ہندوستان کو انگریزوں کے وجود سے پاک کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ اس سلسلے میں اس نے افغانستان، ترکی اور فرانس کے بادشاہوں سے بھی مدد حاصل کرنے کی کوشش کی، تاکہ انگریزوں کے خلاف ایک مضبوط محاذ بنایا جا سکے، مگر اس میں اُسے کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ حیدرآباد اور مرہٹے دونوں اُسے اپنی راہ کا پتھر سمجھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے انگریزوں کی ہر ممکن مدد کی۔ ادھر خود ٹیپو سلطان کے اپنے متعدد عمائدین غداری کر کے انگریزوں سے مل گئے۔ بالآخر سلطان جواں مردی سے لڑتا ہوا شہید ہو گیا (1799ء) اور مسلمانوں کی آخری آزاد سلطنت بھی مٹ گئی۔

میسور کو ختم کرنے کے بعد مرہٹوں سے نمٹنا بھی انگریزوں کے لیے مشکل نہ رہا۔ انہوں نے ایک ایک کر کے تمام ریاستوں پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ باہمی تعاون و امداد کے نام پر انہوں نے مقامی حکمرانوں سے ایسے معاہدے کیے، جن کی رو سے وہ ان کے دشمنوں کے خلاف ان کی حمایت کرنے کا وعدہ کرتے اور اس سلسلے میں وہ نہ صرف اپنے خارجہ تعلقات انگریزوں پر چھوڑ دیتے، بلکہ اپنے ہاں انگریزی فوج کو اپنے خرچ پر رکھنے پر مجبور ہوتے تھے۔ مقامی حکمرانوں کو اپنا وجود قائم رکھنے کے لیے انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرنا ضروری ہو گیا۔ اُن کے محل سازشوں کے اڈے بن گئے، رعایا کی فلاح و بہبود کی بجائے ذاتی عیش و عشرت ان کا مطمحِ نظر ٹھہرا اور ان کے درباروں میں کمپنی کی طرف سے مقرر کردہ مشیر (ریزیڈنٹ) اتنے بااختیار ہو گئے کہ حکمران ان کے اشارۂ ابرو کے پابند ہو کر رہ گئے۔

1804ء میں مرہٹوں سے جنگ ختم ہوئی تو کامیاب و حکمران انگریزوں نے دوآب گنگا و جمنا اور دہلی پر بھی قبضہ کر لیا۔ دارالسلطنت ہاتھ میں آ جانے کے بعد انگریزوں کا وقار اور بھی بڑھ گیا۔ مغل بادشاہ انگریزوں کے وظیفہ خوار کی حیثیت سے صرف لال قلعے کا مالک رہ گیا۔ 1857ء تک یہی حالت رہی۔

(موجودہ پاکستان کے صوبوں پر انگریزوں نے کیسے تسلط حاصل کیا، اس کا مختصر بیان آئندہ شمارے میں ہوگا)